جلد نمبر 2
شمارہ نمبر 3
المنار
جولائی 2016
مجلس طلبائے قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کا علمی و ادبی مجلّہ

پتہ برائے خط و کتابت

editorAlmanar@gmail.com

Click Here to visit TICAA USA **Website**

Click her to visit us on **facebook**

اس شمارے میں

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۲﴾

وہ لوگ جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہوئے بھی اور بیٹھے ہوئے بھی اور اپنے پہلوؤں کے بل بھی اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔(اور بے ساختہ کہتے ہیں) اے ہمارے ربّ! تُو نے ہرگز یہ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ پاک ہے تُو۔ پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

4616{12} حَدَّثَنِي أَبُو الطَّاهِرِ أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ وَهْبٍ أَخْبَرَنِي حَيْوَةُ بْنُ شُرَيْحٍ عَنِ ابْنِ الْهَادِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَبَرُّ الْبِرِّ أَنْ يَصِلَ الرَّجُلُ وُدَّ أَبِيهِ[6514]

4616: حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے والد کے پیاروں سے حسن سلوک کرے۔

میرے والد میرے محسن میرے دوست...راجہ ناصر احمد

حارث راجہ

والدین خدا کی ایک انمول نعمت ہیں۔ ان کا سایہ اولاد کے لیے کڑی دھوپ میں ایک ٹھنڈی چھاؤں کی طرح ہے۔ بعض خوش نصیبوں کو تا دیر اس گھنے سائے کے نیچے اطمینان اور سکون کی لذت اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ جب کبھی بھی یہ سایہ اٹھتا ہے تو ہم و غم کے بادل گرجنے لگتے ہیں اور اس خلا کا احساس بجلیاں بن کر دلوں پر گرتا ہے۔ وقت بڑا مرہم ہے پر یادوں کے طوفان زخم ہرا کر دیتے ہیں۔ شاید اسی کیفیت کو پیارے امامِ خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے یوں بیان کیا:

ہر طرف آپ کی یادوں پہ لگا کر پہرے
جی کڑا کر کے میں بیٹھا تھا کہ مت یاد آئے
ناگہاں اور کسی بات پہ دل ایسا دکھا
میں بہت رویا مجھے آپ بہت یاد آئے

باپ اور بیٹے کا رشتہ بھی عجیب ہے۔ پہلے بیٹا ایک ناتواں حالت میں باپ کی گود میں کھیلتا اور اس کے کندھے پر بیٹھ کر دنیا دیکھتا ہے۔ پھر اس کے شانہ بشانہ چلنے لگتا ہے اس سفر میں وہ بہت کچھ سیکھتا ہے۔ چلتے چلتے بیٹا باپ کی رفاقت کا عادی ہو جاتا ہے اب وہ ایک دوست کی طرح اپنے باپ کی صحبت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ پھر گردش ایام

رت بدل دیتی ہے اور باپ ناتوانی کی حالت کو پہنچ جاتا ہے۔ بیٹا باپ کا قرض تو نہیں چکا سکتا مگر اس کو سہارا دینے اور اس کی خدمت کرنے کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ پھر ایک دن باپ آنکھیں بند کر لیتا ہے اور بیٹا اپنے ہاتھ سے اسے لحد میں اتار کر خدا کے سپرد کر دیتا ہے۔

میرے والد میرے محسن میرے دوست بھی اسی طرح 6 فروری 2016ء کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

میرے والد راجہ ناصر احمد صاحب سلور سپرنگ میری لینڈ جماعت کے رکن تھے۔ ان کو جاننے والے انھیں ایک دراز قد مخلص اور ملنسار وجود کے طور پر جانتے ہیں۔ ایک بے لوث کارکن جو کبھی تو بیت الرحمٰن میں جنرل سیکرٹری کے دفتر میں خدمت بجالا رہا ہے تو کبھی جلسہ سالانہ پر TI College Alumni Association کے انتظامات کرنے میں مصروف عمل ہے۔ بچے انہیں اطفال کلاس کے ایک مشفق استاد کے طور پر جانتے ہیں جو اطفال کی تعلیم و تربیت کے جذبے سے سرشار ہے۔ کبھی وہ اپنے معزز اساتذہ پرویز پروازی صاحب اور مبارک عابد صاحب کے ساتھ مجالس سخن کا انعقاد کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی محترم مولانا نسیم مہدی صاحب کی قرآن کلاس میں ایک اچھوتا سا سوال پیش کر کے ایک منفرد انداز میں مضمون کی وضاحت کا موقع فراہم کر دیتے ہیں۔ یہ جہاں ان کے وسیع مطالعہ کا ثبوت ہے وہاں ان کی مستقل علم حاصل کرنے کی جستجو کی بھی ایک مثال ہے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ سوچ کے پنچھی کو پرواز کرنے دو، سوچو اور غور کرو کیونکہ یہ قرآن کا حکم ہے مگر کبھی بھی اپنے ایمان کے دائرے سے باہر نہ جاؤ۔ یہ ان کا کمال تھا کہ منفرد پہلوؤں پر غور کرنے کے باوجود کبھی اپنے ایمان سے نہیں ہلے۔ ہستی باری تعالیٰ پر بے حد یقین تھا۔ دعا پر غیر متزلزل ایمان تھا۔ اکثر مجھے بتاتے تھے کہ ان کی زندگی خدا تعالیٰ کے احسانات اور دعا کی قبولیت کے تجارب سے بھری پڑی ہے شاید یہی وجہ تھی کہ انھوں نے کبھی کسی چیز کی حرص نہیں کی۔ وہ ہمیشہ اپنی زندگی سے مطمئن رہے۔ وہ زندگی جینے کے قائل تھے محض گزارنے کے نہیں۔ وہ دولت شہرت اور عہدے کی طمع اور لالچ سے بالکل دور تھے۔

نہایت ذہین اور قابل شخص تھے مگر کبھی اپنے علم کا گھمنڈ نہیں کیا۔ خدا کے فضل سے اپنے تعلیمی دور میں المنار رسالہ کے ایڈیٹر رہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے M.A. Physics کیا پھر قائداعظم یونیورسٹی سے فزکس میں M. Phil کی ڈگری حاصل کی۔ Civil Services کا امتحان اعلیٰ درجے میں پاس کیا۔ جب ملازمت لینے کا وقت آیا تو حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں مشورہ کا خط لکھا۔ ان کی خواہش تھی کی ایسے ادارے میں جائیں جہاں رشوت جیسی قباحتوں سے دور رہ سکیں چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالی کے مشورہ پر Pakistan Railways میں ملازمت اختیار کر لی۔ ریلوے میں ۲۲ سالہ دور ملازمت میں بڑی محنت اور ایمان داری سے کام کیا جس کا اعتراف ماتحتوں اور افسران دونوں نے کیا۔ آپ ریلوے میں ایک بااصول افسر کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ پاکستان میں ۱۹۸۴ کے آرڈیننس کے نتیجے میں سرکاری افسران کو کئی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر آپ نے ہمیشہ اپنے احمدی ہونے کا فخر سے اظہار کیا اور کبھی اس بات کو دنیوی فائدہ اٹھانے کے لیے نہ چھپایا۔

2003ء میں ہمارے امریکہ منتقل ہونے کا فیصلہ بہت بڑا فیصلہ تھا۔ والد صاحب اس وقت ریلوے میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مکان، نوکر چاکر، گاڑی وغیرہ ہر قسم

کی سہولیات میسر تھیں۔ مگر انہوں نے ہمارے بہتر مستقبل کی خاطر ان سب چیزوں کو خیر باد کہ کر ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔ امریکہ میں آکر ابتدائی دور ان کے لیے بہت کٹھن تھا مگر انھوں نے ہمیشہ اپنی اولاد کو تعلیم پر دھیان دینے کی تلقین کی اور اخراجات کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ ان کا یہ احسان میں اور میرے بہن بھائی کبھی نہیں چکا پائیں گے۔ انھوں نے اپنا آج ہمارے کل کے لیے بخوشی قربان کر دیا۔ مشکل حالات میں بھی ہمیشہ مثبت رہنا اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں خوشیاں ڈھونڈنا ان کا خاصہ تھا۔ مجھے یاد ہے ابھی ہم چھوٹے چھوٹے بچے تھے جب والد صاحب نے پاکستان میں پہلی بار ایک پرانی سی کار خریدی۔ والد صاحب ہم سب کو کار میں بٹھا کر سیر پر لے گئے۔

شروع شروع میں امریکہ میں وسائل کی کمی کے باوجود انھوں نے بڑی بشاشت سے وقت بسر کیا اور کبھی ناشکری کا کلمہ زبان پر نہ لائے۔ ان کا ہنستا ہوا چہرہ نظروں کے سامنے پھرتا ہے تو بے اختیار مسکراہٹ آجاتی ہے اور آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ سادگی ان کا ایک وصف تھا مگر نفاست نمایاں تھی۔ خوش لباس بھی تھے اور خوش گفتار بھی۔ ہمیشہ عزت نفس کا خیال رکھتے مگر کبھی غرور نہیں کیا۔

وہ مجالس کی جان ہوا کرتے تھے۔ موقع اور محل کے مطابق کوئی لطیفہ، چٹکلہ یا شعر سنا کر وہ محفل کو لطف اندوز بنا دیتے تھے۔ سنجیدہ گفتگو میں اکثر پرجوش طریقے سے دلائل اور حوالوں کے ساتھ اپنا موقف پیش کیا کرتے تھے۔ ان کا سمجھانے کا انداز بہت دلکش تھا۔ انھوں نے کبھی سوال کرنے پر پابندی نہیں لگائی۔ ہمیشہ بڑی توجہ سے سوال کو سنتے اور اس کا تسلی بخش جواب دیتے۔ میں نے کئی کئی گھنٹے ان کی صحبت میں بیٹھ کر مختلف موضوعات کے بارے میں بہت کچھ جانا ہے۔ ان کی سوچ اعتدال پسند تھی وہ افراط و تفریط سے دور رہتے تھے اور مشورہ دیتے وقت بھی درمیانی راہ اختیار کرتے۔

میں نے رشتوں کی قدر کرنا اپنے والد صاحب سے سیکھا ہے۔ ان کا آبائی گاؤں ڈلوال ضلع چکوال تھا اور میرے ننھال دولمیال سے ہیں۔ گو کہ ان دونوں گاؤں میں ایک سڑک کا فاصلہ ہے مگر مزاج اور عادات کا فرق نمایاں ہے۔ میرے والدین کی یہ بڑی خوبی تھی کی انھوں نے بچوں میں ننھیال اور ددھیال کا فرق پیدا نہیں ہونے دیا۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم نے دونوں طرف کے رشتوں سے خوب پیار لیا۔ خدا کرے کہ یہ تعلق اسی طرح قائم رہے۔

میرے والد صاحب نے ہمیشہ اپنے سسرال کی عزت کی اور انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اقرباء کی ضروریات کا خیال رکھتے اور جس حد تک ممکن ہو تا مدد کرتے۔ اسی طرح مشکلات اور پریشانی کے دوران اقرباء کی دلجوئی کرتے اور خلوص دل سے ان کا ساتھ دیتے۔

میرے والد خاندانی تاریخ کا ذکر بھی اکثر کیا کرتے۔ ان کا مقصد ہمیں اپنے بزرگوں کے حالات سے آگاہ کرنا اور ان سے ایک جذباتی لگاؤ قائم کرنا ہوا کرتا تھا۔ اکثر ہمیں اپنی والدہ کے دادا حضرت منشی محمد خان صاحب رضی اللہ تعالیٰ کا ذکر سناتے۔ حضرت منشی صاحب حضرت مسیح موعودؑ کے 313 اصحاب میں شامل ہیں۔

والد صاحب اکثر ہم سے حضرت منشی صاحب کے متعلق حضرت مسیح موعودؑ کے ایک الہام کہ "اولاد کے ساتھ نرم سلوک کیا جائے گا" کا ذکر کرتے اور اس الہام کی تفسیر خاندانی حالات کے پس منظر میں سمجھاتے۔ ہمیں بتاتے کہ منشی صاحب کی اولاد میں سے جو بھی جماعت اور خلافت سے منسلک رہا اس کے لیے یہ الہام پورا ہوا۔

اسی طرح میرے دادا جان راجہ فضل داد خان صاحب کا ذکر بھی سناتے اور ان کے قبولیت احمدیت کے ایمان افروز واقعات سنا کر ہماری تربیت کرتے۔ والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ ہمارے دادا نے ۱۹۴۴ء میں اپنے گاؤں میں ایک مناظرہ بھی کروایا جس میں مولانا محمد یار عارف، مولانا احمد علی شاہ اور مولوی محمد حسین صاحب نے جماعت کا موقف پیش کیا۔ اس مناظرہ میں دلمیال کی جماعت نے بھی شرکت کی جو حضرت مسیح موعودؑ کے زمانے میں ہی جماعت میں شامل ہو گئی تھی اور ان کا ذکر تاریخ احمدیت میں بھی درج ہے۔

والد صاحب کی تربیت کا انداز بھی عملی تھا۔ انھوں نے اپنی مثال قائم کر کے بچوں کی تربیت کی۔ اس طرح والد صاحب کے ساتھ ایک دوستی کا معاملہ تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ بہتری کی طرف سفر کبھی نہیں رکنا چاہیئے۔ اگر اپنے اندر کوئی خامی دیکھو تو اسے دور کرنے کی کوشش کرتے رہو۔ آہستہ آہستہ شعوری طور پر اپنے آپ کو بہتر کرنے سے بہتری آجائے گی۔ اس کی ایک مثال ان کی ذات میں یہ ہے کہ وہ طبعاً غصے والے تھے اور بچپن میں پاکستان میں عام رواج کے مطابق ہمیں سختی سے ڈانٹ بھی لیا کرتے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے غصے کو کم کرنے کی شعوری کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقت کے ساتھ وہ نہایت حلیم الطبع ہو گے اور ان کی طبعیت کی سختی جاتی رہی۔

ان کی سکھائی ہوئی باتیں اور ان کی یادیں ہمارا سرمایا ہیں۔ ان کی وفات پر حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے ازراہ شفقت ان کی غائبانہ نماز جنازہ 13 فروری 2016ء کو مسجد فضل لندن میں پڑھائی۔ خاکسار کو اس جنازہ میں شامل ہونے کی توفیق ملی۔ بعد ازاں حضور انور سے ملاقات کا شرف بھی ملا۔ حضور انور نے فرمایا "نیک اور شریف آدمی تھے"۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور انھیں اپنی ابدی جنتوں کا وارث بنائے۔ آمین،

میرے خواب تم سے میرا نام تم سے
میرا جو بھی ہے وہ مقام تم سے
میرے غم کا صحرا ہے میرے اندر
میرا مسکرانہ سرعام تم سے
وہ تم سے دلکش تھا لمحہ لمحہ
تھا زیست کا انصرام تم سے
جو تم نہیں ہو تو کھوجتا ہوں
وہ صبح کی رونق وہ شام تم سے
ہے میری خلوت میں گونجتا اب
وہ جلوتوں میں کلام تم سے
تمہاری یادوں سے ہیں مزین
جو تھے حسیں دروبام تم سے

(حارث راجہ)

RESOLUTION ON THE SAD DEMISE OF RAJA NASIR AHMAD

(This resolution was unanimously passed today, Sunday, February 14, 2016 in a meeting of members held at Masjid Bait-ur-Rahman Silver Spring Maryland.)

We the members of Talim-ul-Islam College Alumni Association USA express our condolence on the sad demise of our dear friend and dedicated member of our Association who passed away on February 6, 2016 at the age of 63.

Mohtram Raja sahib was an active member of Silver Spring Maryland Jamaat. He was instrumental in establishing Talim-ul-Islam College Alumni Association in the United States. He passionately served the association as its first General Secretary for years 2012 - 2015. He was very well connected with the Alumni and had a large circle of loving friends from his Alma Mater and beyond who always cherished his company.

Many of his Alumni friends were deeply concerned about his deteriorating health and they continuously prayed for him after learning about his illness.

We know from his family that Mohtram Raja sahib was very content with what was coming to him and he did not show any signs of worry and distress. He was at peace with himself, his family and God Almighty when he breathed his last on February 6, 2015 while in the company of his loved ones.

O soul at peace!

Return to thy Lord well pleased with Him and He well pleased with thee.

So enter thou among My chosen servants,

May Allah shower His choicest blessings upon his soul and enable his family to bear this loss with patience and steadfastness. Amin.

We are the members of Talim-ul-Islam Alumni Association USA

This 14th day of February, two thousand and sixteen.

Resolution on the Sad Demise of Prof. Saeedullah Khan Sahib

We the members of Talim-ul-Islam College Alumni Association USA express our condolences to the family of Professor Saeedullah Khan sahib who passed away on April 15, 2016 at the age of 90 in Rabwah, Pakistan.

Mohtram Professor Saddullah Khan sahib was the maternal grandson of Hazrat Mian Karim Bux sahib who was a companion and served as a special chef of the Promised Messiah (as).

Professor Saeedullah Khan sahib held an MSc in Statistics. He was the head of Statistics Department at T. I. College Rabwah and taught there for 35 years.

He also served as a warden in Fazl-e-Umar Hostel, Talimul Islam College Rabwah for a number of years.

He had a very pleasant personality. His students as well as his colleagues, who are now spread all over the world, had a great love and respect for him for

the dedication he showed towards their academic careers.

He is survived by two daughters and two sons.

May Allah shower His choicest blessings upon his soul and enable his family to bear this loss with patience and steadfastness. Amin.

ایک امریکی شہری
ظریف خان

تحریر: کیتھرین شلز—ترجمہ: سفیر رامہ

شیریڈن، ویومنگ (Sheridan, Wyoming) میں سب سے پہلے جس شخص کو ہاٹ تمالے لوئی (Hot Tamale Louie) کے چاقو کے وار سے قتل ہونے کی خبر ملی وہ ولیم ہینری ہیریسن جونئیر (William Henry Harrison, Jr.) تھا۔ یہ خبر قتل کے ایک دن بعد بذریعہ ٹیلیگرام موصول ہوئی تھی۔ ہیریسن ایک کانگرس مین کا بیٹا، ایک امریکی صدر کا پڑپوتا۔ اور ایک ایسے شخص کی نسل سے تھا جو امریکہ کے دستور پر دستخط کرنے والوں میں شامل تھا۔ ہاٹ تمالے لوئی کے نہ کوئی باپ کو جانتا تھا نہ پڑدادا کو اور نہ ہی وہ کسی ایسی مشہور شخصیت کی نسل سے تھا جس نے امریکہ کے دستور پر دستخط کیے ہوں۔ وہ اس زمانے سے شیریڈن میں تمالے فروخت کر رہا تھا جب بفیلو بل (Buffalo Bill) نے اس شہر کی پریڈ میں شرکت کی تھی۔ جب امریکی صدر ٹافٹ نے شیریڈن کا دورہ کیا اسوقت بھی وہ
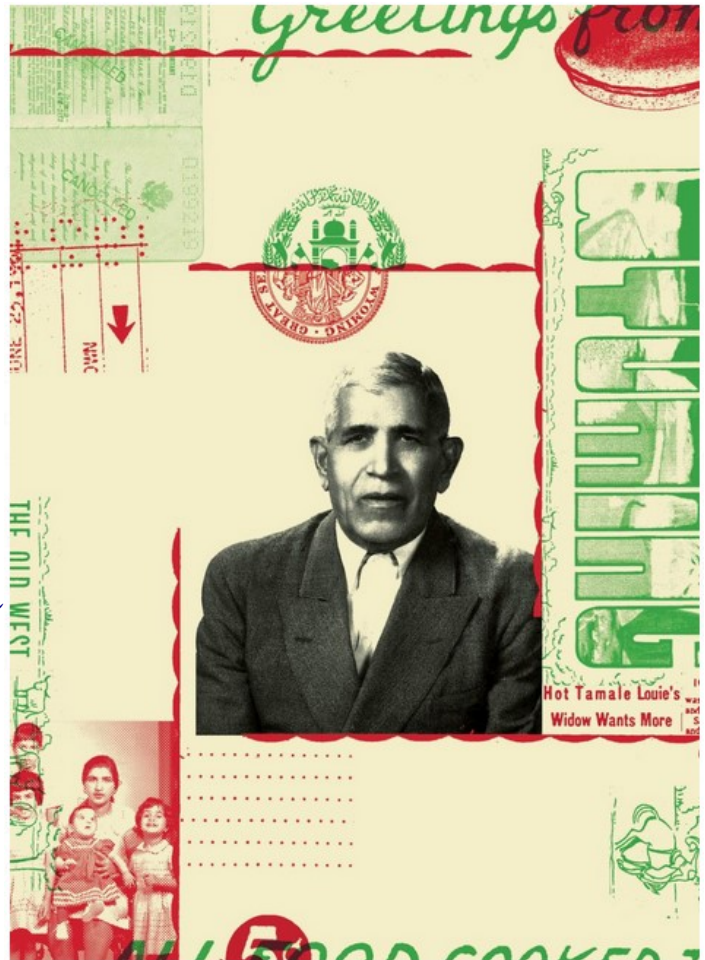
تمالے فروخت کر رہا تھا اور تب بھی جب روس نے خلا میں سپٹنک راکٹ بھیجا تھا اور برطانیہ نے بیٹلز (Beatles) کو امریکہ بھجوایا تھا۔

تب تک ہاٹ تمالے لوئی اس علاقے کی ایک تاریخی شخصیت بن چکا تھا۔ اس کے قتل سے ہر کسی کو صدمہ پہنچا۔ شیریڈن کے اخباروں میں یہ خبر جلی سرخیوں سے پہلے صفحے پر نمایاں طور سے شائع ہوئی۔ اور اسی طرح سارے ویومنگ، کولوراڈو اور ساؤتھ ڈکوٹا میں بھی اخباروں نے اسے جلی سرخیوں سے چھاپا۔ اس خبر کا تذکرہ ییلوسٹون تک پہنچا۔ اور بذریعہ ڈاک کیلیفورنیا تک بھی جہاں شیریڈن سے نقل مکانی کر کے جانے والوں کو وطن سے آنے والے خطوط کے ذریعہ علم ہوا کہ وہاں انکے عزیز و اقارب میں صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔

یہ ۱۹۶۴ء کا واقعہ ہے۔ اسکے دو سال بعد قاتل پر مقدمہ چلا اور اسے مجرم قرار دے کر نہ صرف پھانسی دی گئی بلکہ اسکی لاش کو اتار کر ایک بار پھر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ چند ہی سالوں میں لوئی، اسکا قتل، اسکے تمالے اور اسکے بارے میں باقی سب کچھ لوگوں کے ذہن سے محو ہو گیا۔ پچاس سال گذر گئے۔ اسکے بعد اچانک پچھلے سال کے آخر میں پھر سے اسکا تذکرہ اخباروں میں ہونے لگا۔

جن واقعات نے دوبارہ اسکی یاد تازہ کروائی وہ شیریڈن سے نوے منٹ کے فاصلے پر واقع ایک دوسرے شہر جیلیٹ (Gillette) میں پیش آئے جو ویامنگ کے مرکز میں دریائے پاؤڈر کے انرجی کے وسائل سے بھرپور لیکن خشک دہانے پر ایک ویرانے میں واقع ہے۔ جیلیٹ کے چاروں طرف کوئلے کی کانیں اور کوئلے کی تلاش میں کھودے گئے ویران گڑھے ہیں۔ سوائے حماموں کے پانی کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔ ہر وقت زمین سے آتش فشاں پھٹنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ تمام کاروبار انرجی سے وابستہ ہے اسی لیے اس میں اونچ نیچ آتی رہتی ہے۔ جب خوشحالی کا دور آئے تو شہر کی آبادی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جسکی وجہ سے کئی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ جرائم اور طلاقوں کی شرح بڑھ جاتی ہے، اسکولوں میں حاضری کم ہو جاتی ہے اور ایسے دماغی امراض زیادہ ہو جاتے ہیں جنہیں ستر کی دہائی سے جیلیٹ کی بیماری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اب یہ شہر اتنا پھیل گیا ہے کہ ہائی وے سے شہر کے لیے تین راستے نکلتے ہیں۔ اسمیں فاسٹ فوڈ کے کئی ریستوران ہیں۔ چاروں طرف تیل کے کنوئیں اور کانیں ہیں۔ ہائی وے پر پچاس میل کی رفتار سے چلنے والی ہواؤں سے خبردار کرنے کا بورڈ لگا ہوا ہے۔

ویامنگ کے شمال مشرقی علاقے میں دو سو کے قریب مسلمان آباد ہیں۔ گذشتہ سال کے آخر میں انہوں نے آپس میں رقم جمع کر کے جیلیٹ کی کنٹری کلب روڈ کے آخر پر کنٹری کلب سٹیٹس کے باہر ایک اچھے علاقے میں ایک منزلہ مکان خریدا۔ اسکے فرش پر جائے نمازیں بچھائیں، سڑک کی کنارے پر ایک بورڈ لگایا اور یہاں جمعہ کی نماز ادا کرنی شروع کر دی۔ یوں اس مکان میں کوئی تبدیلی کیے بغیر عملاً اسے ویامنگ ریاست کی تیسری مسجد بنا دیا۔

زیادہ تر مقامی رہائشیوں نے اسپر کسی خاص ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ لیکن چند لوگوں نے 'جیلیٹ کو اسلام سے بچاؤ' کے نام پر تنظیم قائم کر کے اس مسجد کے قیام کے خلاف احتجاج شروع کر دیا۔ وہ ویامنگ میں مسلمانوں کو خوش آمدید کہنے کے خلاف تھے۔ انکا خیال تھا کہ مسلمان ویامنگ کی معاشرتی روایات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ انہیں یہ خطرہ بھی تھا کہ مسلمانوں میں دہشت پسند جہادی عناصر بھی چھپے ہونگے۔ جب انکا احتجاج دھمکیوں کی صورت اختیار کر گیا تو

پولیس اور ایف۔بی۔آئی کو مداخلت کرنی پڑی۔

جیلیٹ سے باہر جن لوگوں نے بھی 'جیلیٹ کو اسلام سے بچاؤ' تنظیم کے بارے میں سُنا، انکے سیاسی خیالات جیسے بھی تھے وہ اسبات پر ضرور حیران ہوئے کہ امریکہ کے اتنے دور دراز کے علاقے میں بھی مسلمان آباد ہیں۔ ویامنگ رقبے کے اعتبار سے بہت وسیع ریاست ہے۔ اتنی بڑی کہ اسمیں سارا نیو انگلینڈ کا علاقہ بلکہ اسکے ساتھ اگر میری لینڈ اور ہوائی کو بھی شامل کر لیا جائے تو وہ سب اسمیں سما سکتے ہیں۔ لیکن اسکی آبادی امریکہ کی سب ریاستوں سے کم ہے۔ یہاں صرف چھ لاکھ لوگ رہتے ہیں۔ جو کنٹکا کی (Kentucky) ریاست کے شہر لوئیس ول کی آبادی سے بھی کم ہیں۔ ویامنگ میں مسلمانوں کی کُل آبادی بھی بہت تھوڑی یعنی فقط سات یا آٹھ ہزار ہے۔

'جیلیٹ کو اسلام سے بچاؤ تنظیم' والوں کا یہ دعویٰ البتہ غلط تھا کہ جن مسلمانوں نے جیلیٹ میں مسجد بنائی تھی وہ اس علاقے میں نئے آئے تھے۔ دراصل وہ ویامنگ کے ان بیس فیصد مسلمانوں میں سے تھے جن کے خاندان پچھلے سو سال سے یہاں رہ رہے ہیں۔ ان کا مورث اعلیٰ ظریف خان نامی ایک نوجوان تھا جو ۱۹۰۹ء میں امریکہ آیا تھا۔ ظریف خان افغانستان اور پاکستان کے سرحدی علاقے میں درہ خیبر کے نزدیک ایک گاؤں باڑہ میں ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوا تھا۔ اسکے ماں باپ غریب تھے۔ ان دنوں وہ علاقہ سیاسی انتشار کا شکار تھا۔ اسکا بچپن یقیناً محرومیوں اور لڑائی جھگڑوں کے خوف کا شکار ہو گیا ہو گا۔ خاندانی روایت کے مطابق وہ بارہ سال کی عمر میں گھر سے چلا گیا تھا۔

اسکے بعد اسکی گزر بسر کہاں اور کیسے ہوئی، اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ البتہ ۳ ستمبر ۱۹۰۹ کو وہ اپنے گھر سے جنوب کی طرف ایک ہزار میل دور بمبئی پہنچ چکا تھا۔ جہاں سے اس دن وہ پینو نام کے بحری جہاز پر سوار ہوا اور آٹھ ہفتوں کے سفر کے بعد ۲۸ اکتوبر کو امریکہ کے شہر سیاٹل پہنچ گیا۔ وہاں سے اس نے اندرون ملک کا سفر شروع کیا۔ کچھ عرصہ ساؤتھ ڈکوٹا کے شہر ڈیڈ ووڈ اور اسکے نزدیکی شہروں لیڈ اور سپیر فش میں گزارنے کے بعد اس نے ویامنگ کی سرحد عبور کی۔ اور بالآخر شیریڈن میں رہائش اختیار کر لی۔ وہاں اسنے جلد ہی ہاٹ تمالے لوئی کے نام سے سب کے من پسند میکسیکن فوڈ بیچنے والے کے طور پر خوب نام کمایا۔

جب ظریف خان ویامنگ پہنچا تو ویامنگ ریاست اور اسکی عمریں تقریباً برابر تھیں۔ وہ بیس بائیس سال کا تھا اور ویامنگ کو ریاست کا درجہ ملے انیس سال ہوئے تھے۔ ان دنوں کسی کا ویامنگ آ کر رہائش اختیار کرنا ایک انوکھی بات سمجھی جاتی تھی۔ ریڈ انڈین تو وہاں ہزار سال سے رہ رہے تھے۔ یوروپین پہلی بار وہاں ۱۷۴۳ء میں آئے پر زیادہ دیر نہ ٹکے۔ ۱۷۹۰ء تک ساری ریاست کی آبادی بمشکل نو ہزار تھی۔ خیال تھا کہ ریل گاڑی ویامنگ سے گزرے گی تو آبادی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ پر اُلٹا یوں ہوا کہ ریل گاڑی آنے کے بعد یہ مسئلہ اور گمبھیر ہو گیا۔ تاریخ دان ٹی اے لارسن نے لکھا ہے کہ ہزاروں لوگوں نے ریل پر سفر کے دوران کھڑکیوں سے ویامنگ کو دیکھا۔ اور یہ مشہور کر دیا کہ ویامنگ کا سارا علاقہ اجاڑ اور بیابان ہے۔

یہ بات شمال مشرقی ویامنگ کے لیے درست تھی۔ باقی ریاست بھی سنگین پہاڑی سلسلوں سے بھری پڑی تھی لیکن وہاں شاندار قدرتی نظارے بھی تھے۔ پہاڑی سلسلے ایک دوسرے کے پیچھے افق تک پھیلے ہوے یوں دکھائی دیتے تھے جیسے سمندر میں بلند و بالا لہروں

کا طلاطم منجمد ہو گیا ہو۔ اسکے مقابلے میں مشرقی ویامنگ میں یہ حال تھا کہ پانچ سو میل تک کوئی درخت دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہوم سٹیڈ ایکٹ کے تحت وہاں رہائش پزیر ہونے والوں کو ایک سو ساٹھ ایکڑ زمین مفت ملتی تھی۔ لیکن روئیدگی بہت کم ہونے کی وجہ سے وہاں پانچ گائیں بھی نہیں پالی جاسکتی تھیں۔ سردیوں میں درجہ حرارت صفر سے پچاس ڈگری نیچے چلا جاتا۔ اور مئی کے مہینے میں بھی ایسے برفانی طوفان آتے کہ کئی لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ کہاوت مشہور تھی کہ ٹیکساس مردوں اور کتوں کے لیے جنت ہے پر عورتوں اور گھوڑوں کے لیے جہنم، لیکن ویامنگ سب کے لیے دوزخ ہے۔

شاید اس لیے کہ ویامنگ میں لوگوں کی اشد ضرورت تھی، وہاں شروع ہی سے تنگ نظری نسبتاً کم تھی۔ ۱۸۸۹ء سے ہی وہاں عورتوں کو ووٹ ڈالنے اور جیوری میں چناؤ کی آزادی حاصل تھی۔ انہیں تنخواہ بھی مردوں کے برابر ملتی تھی۔ سوزن بی اینتھونی کے کہنے کے مطابق، خدا کی سرسبز و شاداب زمین پر یہ واحد جگہ تھی جہاں لوگ واقعتاً آزاد تھے۔، جب ویامنگ نے ریاست کا درجہ حاصل کرنے کے لیے درخواست دی توامریکی کانگرس کے دباؤ کے باوجود عورتوں کو مساوی حقوق دینے کی ضد نہ چھوڑی۔ ۱۸۹۰ء میں ویامنگ کو ریاست کا درجہ مل گیا۔ اسوقت وہ امریکہ کی واحد ریاست تھی جہاں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ تب سے اسکا دوسرا نام مساوی حقوق والی ریاست پڑ گیا۔

جب ویامنگ کو ریاست کا درجہ ملا تو شیریڈن ایک مختصر سی آبادی تھی۔ یہ جگہ بگ ہارن کے مشرق میں مونٹینا (Montana) کی سرحد کے بہت قریب تھی۔ اسکے علاوہ باقی دور دور تک ویرانہ تھا۔ دو سال بعد جب یہاں پر کوئلہ ملنے کی سچی اور سونا دریافت ہونے کی جھوٹی افواہیں پھیلیں تو شیریڈن کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ ۱۹۰۹ء میں جب ظریف خان یہاں آیا تو اسکی آبادی آٹھ ہزار کے لگ بھگ پہنچ گئی تھی۔ اگر اس زمانے کے مقامی اخباروں کے بزنس سیکشن کو دیکھیں تو لگتا ہے کہ ان دنوں وہاں مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں نے رونق لگا رکھی تھی۔ اور ایک نئی سرحدی آبادی جیسا ماحول بن گیا تھا۔ شہر میں سترہ لوہار، ایک بائیسکلوں کا ڈیلر اور بگھیاں بیچنے والوں کی پانچ دوکانیں تھیں۔ مستقبل کا حال بتانے والی ایک عورت مسز ایلن جانسٹن بھی تھی۔ اور بڑی تعداد میں کوئلے کی کانوں کے مزدور تھے۔ تفریح کے لیے باولنگ ایلی، اوپرا ہاؤس اور ہیلتھ ریزورٹ تھا۔ ناخن پالش کروانے کے لیے مسز روز یلاووڈ تھی جو مالش بھی کر سکتی تھی۔ دو اخبار شائع ہوتے تھے، ایک ریپبلکن اور دوسرا ڈیموکریٹ پارٹی کا۔ بازار سے غلہ، اسلحہ، گھوڑے، کتابیں، کاپیاں، کافی، کیمپنگ کا سامان، دستانے، موسیقی کے آلات اور دیگر اشیا مل جاتی تھیں۔

لیکن شیریڈن کی کاروباری فہرست میں سب سے انوکھا کاروبار تمالے بیچنے والے کا تھا۔ ظریف خان نے جب تمالے بیچنے شروع کیے

توابتدا میں وہ بانس کیساتھ دو ٹوکریاں باندھ کر اسے کندھے پر جمالیتا اور گاہکوں کی تلاش میں چل نکلتا۔ دوپہر کو لنچ کے وقت بنک کے سامنے، رات کو شراب خانوں کے باہر اور ریل گاڑی آنے کے وقت اسٹیشن پر۔ اس کا کام اتنا چل نکلا کہ اسنے ایک ریڑھی خرید لی۔ ۱۹۱۴ء تک اخبار شیریڈن انٹرپرائز میں اسکا ذکر ایک جانے پہچانے ترک تامل بیچنے والے کے طور پر ہونے لگا تھا۔ (دراصل اسکی قومیت کے بارے میں سب خبریں، بمع اسکے اپنے بیان کے، غلط تھیں۔ کیونکہ اسکی پیدائش سے بھی پہلے اسکا گاؤں ہندوستان میں برطانوی حکومت کے زیر نگیں آ گیا تھا۔ اور آزادی کے بعد اب پاکستان کے سرحدی علاقے فاٹا میں شامل ہے)۔

۱۹۱۵ء میں یا شاید ایک سال بعد ظریف خان نے گرینل اور مین سٹریٹ کی نکڑ پر اپنا چھوٹا سا ریستوران کھول لیا۔ اور اسکا نام 'لوئی کا ریستوران' دروازے سے کچھ اوپر بڑے حروف میں لکھوایا۔ اسکے بعد ہمیشہ کے لیے ظریف خان اور اسکا ریستوران، دونوں اسی نام سے پہچانے جانے لگے۔ اسمیں ایک کھڑکی تھی جو سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ گاہک سڑک پہ چلتے ہوئے اس کھڑکی پر رک کر آرڈر دیتے اور پیک کرواکے ساتھ لیجاتے۔ اندر ایک کاؤنٹر تھا جسکے ساتھ ان گاہکوں کے لیے اسٹول لگے تھے جو بیٹھ کر کھانا پسند کرتے تھے۔ تمالے کے علاوہ چلّی، پائی اور برگر بھی ملتے تھے۔ آئیس کریم سب ذائقوں میں ملتی تھی سوائے چاکولیٹ کے کیونکہ اس سے ظریف خان کو اپنی قمیض پر داغ پڑنے کا خدشہ تھا۔

ناموں کے اعتبار سے ریستوران کے مینیو میں سے صرف تمالے ہی کو ایسی اہمیت ملی کہ یہ ظریف خان کی پہچان بن گیا۔ شیریڈن کے لوگ ظریف خان کو ہاٹ تمالے لوئی کے نام سے ہی جانتے تھے۔ یا اسکو تمالے لوئی بلکہ عام طور پر لوئی تمالے کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ یہ نام زیادہ اسان تھا۔ وہ چاہے سٹیک بھی بیچتا تب بھی اسکا یہی نام رہنا تھا۔ کھانے پینے کے شوقین لوگوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے لوئی کے تمالے سے بڑھ کر لذیذ اور کوئی چیز کبھی نہیں کھائی۔ وہ تمالے اپنے گھر پر اپنی پالتو مرغیوں کے گوشت سے بناتا تھا۔ جنہیں حلال طریقے سے ذبح کیا جاتا تھا۔ ایورٹ میک گلوتھن نے آخری بار لوئی کا بنایا ہوا تمالے پچاس کی دہائی میں ان دنوں چکھا تھا جب وہ ہائی اسکول کا طالبعلم تھا اور لوئی کے ریستوران میں جزوقتی ملازم تھا۔ اسکا اب بھی یہ کہنا ہے کہ اس نے زندگی میں اس سے زیادہ لذیذ چیز پھر نہیں کھائی۔

لوئی کے گاہکوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنکا دعوٰی ہے کہ اسکے برگر لاجواب تھے۔ آج بھی اگر کہیں لوئی کا ذکر چل رہا ہو تو کبھی یوں بھی ہوتا ہے کے کمرے کے دوسرے کونے سے کوئی اٹھ کر آتا ہے۔ اور گفتگو میں یہ کہہ کر دخل انداز ہو جاتا ہے کہ برگر بنانے کی پوری تاریخ میں آج تک کسی نے لوئی سے بڑھیا برگر نہیں بنائے۔ شیریڈن کے رہائشیوں کی پانچ نسلوں نے لوئی کے برگر کھائے ہیں اور اب بھی انکے ذائقے کی تعریف کرتے ہوئے ان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے جیسے وہ ان برگروں کے مزے کی یاد میں گم ہو گئے ہوں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ لوئی اپنے برگروں

میں بھینسے کا گوشت استعمال کرتا تھا۔ اور انہیں تلنے کے لیے چربی بھی خود تیار کرتا تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ مرغی کی چربی استعمال کرتا تھا جسمیں دھنیے کے پتے ڈالے ہوتے تھے۔ یا اسمیں دل اور زبان کا گوشت ملایا ہوتا تھا۔

اصل بات کچھ بھی ہو، پر اسمیں شک نہیں کہ برگر پیش کرنے کا اسکا اپنا ایک انداز تھا۔ ان پر پنیر لگانے کا تو سوال ہی نہیں تھا، اسے تو یہ بھی پسند نہیں تھا کوئی اس سے کیچپ بھی مانگے۔ وہ اپنے برگر بالکل سادہ رکھتا تھا۔ یا اگر گاہک کی خواہش ہو تو ساتھ مسٹرڈ، سرکے سے ترش کیے ہوے کھیرے یا پیاز مانگ سکتا تھا۔ (لوئی کے بعض پرانے مستقل گاہک جو اب ستر، اسی سال کے پیٹے میں ہیں۔ ان سے میرے بات ہوئی ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ لوئی کس انداز سے ہاتھ میں پکڑے ہوے چاقو سے اشارہ کر کے ان سے پوچھا کرتا تھا۔ "بتاؤ، تمھیں کٹے ہوے پیاز بھی چاہییں؟")۔ کھیروں کو وہ اس پھرتی سے لمبی قاشوں میں کاٹتا تھا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔ عموماً وہ روزانہ ڈیڑھ سو کے قریب برگر بیچتا تھا۔ لیکن جن دنوں بیلوں کے کھیل تماشے کا میلہ لگتا۔ وہ ایک اور انگیٹھی تیار کرتا اور کسی نوجوان کو وقتی طور ملازم رکھ لیتا۔ کیونکہ میلے کے دوران اکثر بھری ہوئی بسیں اسکی دوکان کے سامنے رکتیں اور بیک وقت سو سے زائد برگر بنانے پڑتے۔ ۱۹۱۹ء تک ریسٹوران اتنا اچھا چل نکلا تھا کہ ساتھ عورتوں کے لیے ایک الگ کمرہ بنا دیا گیا۔ جسمیں، جیسا کہ شیریڈن پوسٹ نے اک رپورٹ میں بتایا۔ "عورتوں کی سہولت کے لیے میزیں لگائی گئی تھیں۔" یہ بھی ایک تنگ کمرہ تھا۔ جہاں میزوں کی کل تعداد تین تھی۔ پھر بھی یہ شہر کی عورتوں کی پسندیدہ جگہ بن گئی۔

ریسٹوران اس لیے بھی منافع بخش تھا کہ سارا ہفتہ اور سال کے ۳۶۵ دن کھلا رہتا تھا۔ ظریف خان صبح دس بجے کھانا پکانے کی تیاری شروع کر دیتا۔ ریسٹوران کی کھڑکی گیارہ بجے کھول دی جاتی۔ پھر یہ رات بارہ بجے تک یا جب تک شراب خانوں سے فارغ ہو کر لوگ گھروں کو نہ چلے جاتے، کھلا رہتا۔ ہر کوئی یہاں سے کھانا خرید سکتا تھا۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ساری دوکانوں پر "ریڈ انڈین اور کتے کا داخلہ ممنوع ہے" کی تختی لگی ہوتی تھی۔ لیکن ظریف خان ریڈ انڈین گاہکوں کو بھی خوش آمدید کہتا۔ جسکی وجہ سے بہت سے ریڈ انڈین اسکے مستقل گاہک بن گئے۔ دوسری جنگ عظیم کا ریڈ انڈین ہیرو اور مشہور سکالر جو میڈیسن کرو (Joe Medicine Crow) جو ابھی پچھلے سال ہی ۱۰۲ سال کی عمر میں فوت ہوا ہے۔ وہ اسکے برگروں کا اتنا دلدادہ تھا کہ جنگ سے واپسی پر اپنے گھر مونٹینا (Montana) جاتے ہوے اسکی ریل گاڑی شیریڈن کے سٹیشن پر ۳۰ منٹ کے لیے رکی۔ تو وہ گاڑی سے اتر کر سیدھا ظریف خان کے ریسٹوران جا پہنچا۔ ابھی وہ برگر کھا ہی رہا تھا کہ گاڑی چل پڑی۔ اور اسکی ماں، جس نے سارے شہر میں اسکی آمد کا جشن منانے کی تیاری کر رکھی تھی، اسکی راہ دیکھتی رہ گئی۔

بچوں، اس پاس کہ قحبہ خانوں میں کام کرنے والی طوائفوں اور خالی جیب لوگوں کے لیے بھی ریسٹوران کے دروازے کھلے تھے۔ کسی کو قیمت ادا کرنے کی سکت نہ بھی ہوتی تو ظریف خان اسکے ہاتھ میں ایک تمالے تھما دیتا۔ بعد میں کبھی اس پر نظر پڑتی تو یہ کہہ کر پکارتا۔ "او میرے دس سینٹ کے مقروض۔" اسکے پاس دس سینٹ ہوتے تو ادا کر دیتا ورنہ اپنی راہ لیتا۔ صرف شراب کے نشے میں مدہوش، گالیاں بکنے والے اور جھگڑالو لوگوں کا اسکے ریسٹوران میں داخلہ بند تھا۔ ظریف خان کا قد ۵ فٹ ۶ انچ اور وزن ۱۲۰ پاؤنڈ تھا۔

لیکن وہ کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ اسمیں ہمت تھی تب ہی تو وہ درہ خیبر سے شیریڈن پہنچ گیا تھا۔ پھر وہ اپنا ایک فُٹ کا چاقو بھی نکال لیتا تھا۔ ویسے دور سے پیاز اٹھا کر مارنے میں بھی اسکا نشانہ پکا تھا۔

شروع میں شیریڈن کے کچھ متکبر لوگوں نے ظریف خان کے ہر کسی سے بلا امتیاز سلوک پر ناک بھوں چڑھائی لیکن بالآخر کوئی بھی اسکے لذیذ کھانوں سے دور نہ رہ سکا۔ اور اسکا ریستوران مساوی حقوق والی چھوٹی سی اصلی امریکن ریاست بن گیا، جمہوری اصولوں پر عمل کرنے والی اور ہر طرح کے لوگوں کی آماجگاہ۔ جہاں رات کو دیر تک کام کرنے والے بھوک سے بیتاب اخباری نمائندے، فیشن ایبل خواتین، اپنی جیبوں میں پڑے سکوں کا گن کر حساب لگانے والے بچے اور فراخ دلی سے خرچ کرنے والے امیر اسٹاک بروکر سب مل کر بیٹھتے تھے۔ اس دوران ظریف خان نے بھی امریکن طور طریقے اپنا لیے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں، تقریباً بیس سال امریکہ میں رہنے کے بعد اس نے باقائدہ امریکہ کا شہری بننے کا فیصلہ کیا۔ شہر میں اثر رسوخ رکھنے والے لوگ، جو سب اسکے مستقل گاہک تھے، اسکی مدد کرنے کو تیار تھے۔ چنانچہ جب اسنے امریکن شہریت حاصل کرنے کے لیے درخواست دی تو اسکی تصدیق کرنے والوں میں شہر کی کونسل کا وکیل اور ایک سابق میئر شامل تھے۔

اسکی درخواست کی سماعت ۶ نومبر ۱۹۲۵ء کو ہوئی۔ چونکہ متعلقہ امیگریشن احکام سال میں صرف ایک مرتبہ شیریڈن آتے تھے۔ اسدن ساری کاؤنٹی سے شہریت کے امیدوار جمع تھے۔ سات پولش، چھ اسٹرین، چیکوسلوواکیہ سے چار۔ دو دو یونان، سکاٹ لینڈ، روس اور مونٹینیگرو سے۔ ایک سویڈن سے اور افغانستان سے ہاٹ تمالے لوئی یعنی ظریف خان۔ ۲ فروری ۱۹۲۶ء کو ظریف خان کو شہریت کے کاغذات موصول ہو گئے اور وہ امریکہ کا شہری بن گیا۔ مگر پانچ ماہ بعد ہی اسے ویامنگ کے اٹارنی جرنل کی طرف سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ بنام ظریف خان مقدمے کی سماعت کے لیے حاضر ہونے کا چالان موصول ہو گیا۔

امریکہ میں شہریت کا پہلا قانون جارج واشنگٹن کی صدارت کے پہلے سال کے دوران ۱۷۹۰ء میں بنایا گیا۔ جسکے مطابق صرف سفید فام آزاد لوگ امریکہ کے شہری بن سکتے تھے۔ اس قانون کا مقصد حبشی غلاموں اور ریڈ انڈینز کو امریکی شہریت سے محروم رکھنا تھا۔ امریکہ کی خانہ جنگی کے بعد اس قانون میں یہ تبدیلی کی گئی کہ حبشیوں کو بھی شہری بننے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء کے بعد سے صرف گورے اور کالے شہریت کی درخواست دے سکتے تھے۔

یوں ایشیا سے آنے والوں کی شہریت کا معاملہ درمیان میں ہی لٹک گیا۔ یہ جیسا کہ بعد میں امریکی کانگرس نے خود تسلیم کیا جان بوجھ کر کیا گیا تھا۔ ۱۸۸۲ء میں چینیوں کو شہریت نہ دینے کا قانون نافذ ہوا جسکے مطابق کوئی شخص جو چین میں پیدا ہوا ہو امریکہ کا شہری نہیں بن سکتا تھا۔ ۱۹۱۷ء کے امیگریشن کے قانون میں مشرق وسطی سے لیکر میلانیسیا تک ایک وسیع علاقے کے بہت سے ملکوں کے شہریوں کو امریکی شہریت دینے پر پابندی لگا دی گئی۔ بظاہر تو یہ قوانین بالکل واضح تھے لیکن عملاً یہ ہوا کہ کچھ ایشیائی اپنی امریکی شہریت حاصل کرنے کی درخواستوں میں یہ دعویٰ کرنے لگے کہ وہ بھی سفید فام ہیں۔ آیا یہ بات درست تھی یا نہیں اسپر ملک بھر میں ماہرینِ بشریات، سیاستدانوں، قانون دانوں اور سرکاری افسروں کے مابین ایک گرما گرم بحث چھڑ گئی۔

عدالتوں نے اس مسئلے کو طے کرنے کی کوشش کی تو اسے اور بھی اُلجھا دیا۔ برکلے یونیورسٹی میں لاء کے پروفیسر آین ہانی لوپیز (Ian Haney Lopez) نے اپنی کتاب (White by Race: The Legal Construction of Race) میں اس المیے کے طربیہ پہلو پر روشنی ڈالنے کے لیے رنگ و نسل کا تعین کرنے والے بہت سے عدالتی فیصلے اوران میں کی گئیں قانونی موشگافیوں کی ایک لمبی فہرست دی ہے۔ ان عدالتی فیصلوں کے مطابق: ہوائی کے رہنے والے سفید فام نہیں (سائنسی شہادتوں کی بنا پر)، میکسیکن سفید فام نہیں (سابقہ قانونی فیصلوں کے مطابق)، برما کے رہنے والے سفید فام نہیں (عام مشاہدے کے مطابق)، جاپانی سفید فام نہیں ہیں (سائنسی شہادتوں کی بنا پر)، جو لوگ ایک چوتھائی جاپانی ہیں وہ سفید فام نہیں (سابقہ قانونی فیصلوں کے مطابق)، عرب سفید فام ہیں (عام مشاہدے کے مطابق)، عرب سفید فام نہیں (عام مشاہدے کے مطابق)، ریڈ انڈین سفید فام نہیں (کسی ثبوت کی ضرورت نہیں)۔

جب نچلی عدالتوں میں اسطرح کے بے ربط فیصلوں کی بھرمار ہو گئی تو بالآخر ۱۹۲۲ء میں سپریم کورٹ دخل اندازی کرنے پر رضامند ہو گئی۔ لیکن بجائے اس مسئلے کو حل کرنے کے اسے اور اُلجھا دیا۔ ایک سال کے اندر سپریم کورٹ نے دو قانونی فیصلے دیے۔ پہلا مقدمہ اوزاوا (Ozawa) بنام ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایک جاپانی کا تھا جو برکلے میں پلا بڑھا تھا اور اسی یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا۔ اسکا موقف تھا کہ امریکہ کے شہریت کو قانون کے مطابق وہ سفید فام ہے۔ سپریم کورٹ نے تسلیم کیا کہ اسکی رنگت بہت سے ایسے لوگوں سے زیادہ صاف ہے جنہیں شہریت دی گئی ہے۔ لیکن پھر بھی اسے شہریت دینے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ بتائی کہ قانوناً وہی لوگ سفید فام ہیں جو کاکیژین (Caucasian) نسل سے ہیں۔ ایک سال بعد ایک اور مقدمے میں جسکا مدعا علیہ ایک ہندوستانی بھگت سنگھ تھند تھا، سپریم کورٹ نے یہ وضاحت دی کہ بیشک بھگت سنگھ تھند تیکنیکی اعتبار سے نسلاً کاکیژین ہے۔ لیکن قانون کا مدعا یہ ہے کہ وہی لوگ سفید فام ہیں جنہیں عام طور پہ کاکیژین نسل کا مانا جاتا ہے

ظریف خان کی طرح بھگت سنگھ تھند کو بھی شہریت مل چکی تھی لیکن سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد اسکی شہریت منسوخ کر دی گئی۔ امریکہ کی تاریخ میں زیادہ تر اُن لوگوں کی شہریت منسوخ کی جاتی رہی ہے جنہوں نے جھوٹ بول کر یا دھوکے سے شہریت حاصل کی ہو یا پھر وہ سزا یافتہ مجرم، غدار یا جنگی جرائم میں ملوث ہوں۔ انہی وجوہات کی بنا پر آشوز (Auschwitz) کے سابقہ گارڈ فرینک ڈینز نگر، انارکی پھیلانے کی مجرم ایما گولڈ مین اور روس کے جاسوس سالومن آلڈر سے امریکی شہریت چھین لی گئی تھی۔ لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں امیگریشن ڈیپارٹمنٹ نے ان ایشیایوں کی شہریت بھی منسوخ کرنی شروع کر دی جنہیں عدالتوں نے نئے امیگریشن قوانین سے لاعلمی کی وجہ سے یا جان بوجھ کر انہیں نظر انداز کر کے شہریت دی تھی۔ ماہرِ قانون پیٹرک ویل کے مطابق شہریت منسوخ کرنے کی کوششوں میں اتنی بدانتظامی اور غیر سنجیدگی تھی کہ تیر یا تکے والا معاملہ تھا۔ ایشیایوں کی قسمت تھی کہ اگر نرم دل امیگریشن افسر سے واسطہ پڑ جاتا تو وہ بچ جاتے ورنہ کسی سنگدل لکیر کے فقیر افسر کے ہاتھوں اپنی شہریت سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔

کسی کو یہ علم نہیں کہ ایسے کسی امیگریشن افسر نے ظریف خان کو کیسے تلاش کر لیا۔ ہو سکتا ہے اسنے پاسپورٹ لینے کے لیے درخواست دی ہو۔ یا اسے جیوری ڈیوٹی کے لیے بلایا گیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

کسی نے مقامی اخبارات میں اسکی شہریت حاصل کرنے کی تقریب کے بارے میں پڑھ کر امیگریشن حکام کو شکایت کی ہو۔ یہ جیسے بھی ہوا پر نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کے وکیل ایلبرٹ دی والٹن نے، جس نے ٹی پوٹ ڈوم سکینڈل میں حکومت کا کیس لڑ کر شہرت حاصل کی تھی، ظریف خان کے خلاف غیر قانونی طریقے سے شہریت لینے کا مقدمہ دائر کر دیا۔

ظریف خان کا مقدمہ ایک ایسے وقت میں چلا جب امریکہ میں امیگریشن کی تاریخ کو ایک نئے موڑ کا سامنا تھا۔ ہوا یہ کہ چند دن پہلے ہی سان فرانسسکو میں ایک ہندوستانی وشنو داس بیگائی اور اسکے بیوی بچوں کی شہریت منسوخ کر دی گئی۔ کیلیفورنیا کا رہائشی ہونے کی وجہ سے اسے زیادہ مشکلات کا سامنا تھا۔ کیونکہ کیلیفورنیا میں صرف امریکی شہریوں کو جائداد خریدنے کی اجازت تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وشنو داس بیگائی یہ بہانہ کر کے گھر سے روانہ ہوا کہ وہ ایک کاروباری سفر پہ جارہا ہے۔ اسنے سان ہوزے کے ایک ہوٹل میں کمرہ بک کروایا اور وہاں خودکُشی کر لی۔ اپنے پیچھے ایک خط چھوڑ گیا۔ جس سے پتہ چلا کہ اسکی خودکشی ایک سیاسی احتجاج تھا۔ اسمیں لکھا تھا کہ۔ ’’میں امریکہ یہ سوچ، امید اور خواب لے کر آیا تھا کہ یہی میرا وطن ہوگا۔ اگر اب میں امریکی شہری نہیں ہوں تو میں کیا ہوں؟ میں نے اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے کیا کمایا ہے؟۔‘‘ وشنو داس بیگائی نے خط پر سان فرانسسکو اگزامینر اخبار کا پتہ لکھا تھا۔ جس نے وہ خط شائع کر دیا۔

وشنو داس کی موت کے بعد شہریت منسوخ کرنے کے بارے میں لوگوں کی رائے اور حکومت کی پالیسی میں تبدیلی آنے لگی۔ ۱۹۲۷ء میں سپریم کورٹ نے ایک ہندوستانی کی شہریت کے خلاف مقدمہ لینے سے انکار کر دیا۔ یہ چھوٹی عدالتوں کے لیے پیغام تھا کہ وہ نسلی بنیادوں پر شہریت منسوخ کرنا بند کر دیں۔ اسوقت تک یہ واضح ہو چکا تھا کہ رنگت کا تعین کرنے کے قانونی جھگڑے عملاً بیسود ہیں۔ اور امریکہ کی آبادی کو قانونی جوڑ توڑ سے سفید فاموں کے لیے مختص کرنے کی جنگ ہاری جا چکی ہے۔ اسکے علاوہ نظریاتی بنیادوں پر بنائے گئے امیگریشن قوانین تیزی سے ناقابلِ عمل ہو رہے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے آغاز پر جرمنی کے علاوہ امریکہ واحد ترقی یافتہ ملک تھا جہاں شہریت خاص رنگ و نسل تک محدود تھی۔ اس معاملے میں جرمنی جیسی پالیسیاں رکھنا، خصوصاً جب جرمنی کی اقلیتوں پر مظالم کی خبریں پھیلنے لگیں، امریکہ کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ چناچہ جنگ کے دوران ہی چینیوں پر شہریت کی پابندیاں ختم کر دی گئیں۔ اور جنگ ختم ہونے کے فوراً بعد شہریت حاصل کرنے کے لیے رنگ و نسل کی تمام شرائط منسوخ کر دیں گئیں۔

لیکن یہ سب ظریف خان کے خلاف مقدمے کے فیصلے کے بعد ہوا۔ اسوقت ابھی عدالتیں بضد تھیں کہ شہریت لینے کے لیے سفید رنگت کا ہونا لازمی ہے۔ افغانی اس شرط پہ پورے نہیں اُترتے تھے۔ ظریف خان کو پتہ تھا کہ مقدمہ لڑنا بیسود ہے۔ اس لیے جب وہ عدالت میں پیش ہوا تو اسنے اپنے دفاع میں کچھ نہ کہا۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۶ء کو جج نے اسکے خلاف فیصلہ دیا کہ۔ ’’اسپر ہمیشہ کے لیے ایک شہری کو ملنے والے ہر قسم کے مفادات، حقوق یا فوائد لینے کی مکمل پابندی ہے۔‘‘ ظریف خان ایک سال سے بھی کم امریکہ کا شہری رہ سکا اور پھر عدالت نے اسکی شہریت منسوخ کر دی۔ اسکی شہریت کی درخواست پر لکھ دیا گیا کہ وہ زرد رنگ والی نسل سے ہے۔ مقدمے کے سب اخراجات بمع ٹیکس کے اسے ادا کرنے پڑے۔

ظریف خان کو شہریت چھن جانے پر کوئی رنج اور غصہ تھا بھی تو اسنے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اس کا کبھی ذکر تک نہ کیا۔ اسکے بچوں سمیت جس کسی سے بھی میری بات ہوئی ہے، کسی کو اس واقعہ کا علم نہیں تھا۔ اب اسنے اپنی ساری توجہ امریکنوں کے دل پسند مشغلے یعنی دولت کمانے پر مرکوز کر دی۔

اسکا آغاز ان امیر لوگوں سے ہوا جو اسکے ریستوران میں اسٹولوں پر بیٹھ کر اخبار پڑھا کرتے تھے۔ وہ ان سے پوچھتا کہ انہیں اخبار میں اتنی دلچسپی کیوں ہے تو وہ اس پر ہنستے۔ پر بالآخر انہوں نے اسے اپنی دلچسپی کی وجہ بتا دی۔ ظریف خان نے بھی روزانہ اخبار خریدنا شروع کر دیا۔ جب موقع ملتا وہ پیاز چھیلنے والے لڑکے سے کہتا کہ اپنا کام چھوڑ کر مجھے اخبار کا بزنس پیج پڑھ کے سناؤ۔ ظریف خان لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ نہ ہی اسے اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن اسمیں کئی اور خوبیاں تھیں۔ وہ پیسے بہت احتیاط سے خرچ کرتا تھا۔ بڑی توجہ سے غور و فکر کرنے کا عادی تھا۔ اسمیں صبر بہت تھا۔ اور جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا اچھے اسٹاک پہچاننے کی غیر معمولی صلاحیت بھی تھی۔ شہر میں یہ افواہ عام تھی کہ وہ ۱۹۲۹ء تک ایک ملین ڈالر بنا چکا تھا۔

جب مارکٹ میں تاریخی مندی کا دور آیا تو اسکا بھی بہت نقصان ہوا۔ پر اسکا ریستوران ابھی چل رہا تھا اور اسے کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ اسنے ایسے سٹاک خریدنے شروع کیے جن کی قیمت بہت گر چکی تھی۔ مثلاً اس نے جنرل موٹرز کے اسٹاک خریدے جو اسوقت آٹھ ڈالر کے تھے۔ ۱۹۶۰ء تک انکی قیمت نوے سے اوپر چلی گئی۔ اسی طرح اسنے جنرل الیکٹرک، سٹینڈرڈ آئل، یونین کاربائڈ، ناردرن پیسیفک ریلوے، بی ایف گڈرچ، انٹرنیشنل ٹیلیفون و ٹیلیگراف اور ٹیکساکو کے اسٹاک خریدے۔ اسے یوٹیلیٹی کمپنیوں، انرجی اور کان کنی کی کمپنیوں کے اسٹاک پسند تھے۔ اسنے ہزاروں کے حساب سے آئڈاہو (Idaho) کی ایک زنک اور چاندی کی کان کے اسٹاک تیس سینٹ فی اسٹاک کے حساب سے خریدے اور اسوقت تک نہیں بیچے جب تک انکی قیمت تیس ڈالر نہ ہو گئی۔

۱۹۴۴ء میں اسنے ایلیس ہیلن نام کی ایک عورت کو حساب کتاب دیکھنے اور دوسرے کاموں میں مدد دینے کے لیے ملازمہ رکھ لیا۔ جس نے اگلے بیس سال اسکی ملازمت کی۔ وہ اسکی خط و کتابت کرنے سے لے کر تمالوں پر دھاگہ باندھنے تک سارے کام کرتی تھی۔ بعد میں جب اسکے مالی امور زیادہ پیچیدہ ہو گئے تو ایک باقائدہ اکاؤنٹنٹ بھی رکھ لیا، وہی بل ہیریسن جس کا پڑدادا امریکہ کا صدر تھا۔ اور ایلیس صرف ریستوران کا کام کرنے لگی۔ ظریف خان خود بھی پہلے کی طرح ریستوران میں کام کرتا رہا۔ بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ اسکی آمدنی کا ایک اور ذریعہ بھی ہے۔ اسکے رہن سہن سے بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اسکے مالی حالات بہت بہتر ہو چکے ہیں۔ اسکی رہائش نارتھ سٹریٹ پر اسی مکان میں تھی جہاں وہ ۱۹۰۹ء سے رہ رہا تھا۔ ریستوران بھی اسی چھوٹی سی عمارت میں تھا جو اسنے گرینل سٹریٹ پر کرائے پر لی ہوئی تھی۔ وہ اب بھی ہر جگہ پیدل چل کر جاتا تھا۔ اور روزانہ آٹھ گھنٹے کام کرتا تھا۔

اسکی امارت کا اندازہ صرف اسکی سخاوت سے ہوتا تھا۔ جو پہلے بھی کم نہیں تھی لیکن اب تو سارے شہر میں اسکی شہرت تھی۔ مثال کے طور پر آرچی ناش جب ہائی اسکول میں پڑھنے کے لیے شیریڈن آیا تو اسکا جب جی کرتا گپ شپ کے لیے ظریف خان کے ریستوران چلا جاتا۔ جہاں اسے مفت کھانا ملتا تھا۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد

وہ شیریڈن پوسٹ اخبار میں ملازم ہو گیا۔ اور ظریف خان کے ریستوران کا مستقل گاہک بن گیا۔ پھر اسے ایک مقامی لڑکی سے پیار ہو گیا۔ دونوں کے پاس شادی رچانے کے پیسے نہیں تھے۔ مجبوراً انہوں نے خاموشی سے عدالت جاکر سول میرج کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بات اسنے سوائے ظریف خان کے اور کسی کو نہ بتائی۔ ناش کی بیٹی نے بعد میں بتایا کہ ظریف خان نے اپنے مخصوص لہجے میں اس سے صرف ایک سوال پوچھا تھا۔ "لڑکی کے لیے شادی کی انگوٹھی خریدلی ہے؟۔" ناش کے انکار کرنے پر اسنے اپنا دراز کھولا اور ایک بڑی رقم ناش کے ہاتھ پر رکھی اور اسے کہا کہ جاکر شادی کی انگوٹھی خریدلے۔ یہ انگوٹھی ناش کی بیوی نے تقریباً چالیس سال پہنے رکھی۔

اسطرح کی کہانیاں عام مشہور تھیں۔ ظریف خان ہر ایک کا نام جانتا تھا۔ اسکا معمول تھا کہ ہر کسی سے اسکے بیمار بچوں یا بوڑھے ماں باپ کی خیریت دریافت کرتا۔ وہ کبھی کسی کو برتھ ڈے اور کرسمس کے تحفے دینے نہیں بھولا تھا۔ ہر ایک کو اسپر بھروسا تھا۔ کہ وہ ضرورت کے وقت کام آئے گا۔ بھوکوں کے لیے مفت کھانا، لڑکوں کے کیے نوکری، فوجیوں کے لیے تحفے اور ضرورت پڑنے پر رقم، ہر طرح کی امداد اس سے مل جاتی تھی۔ وہ ہر ایک کا خیال کرتا تھا پر اپنے بارے میں اسنے کبھی کچھ نہ بتایا۔ اسکے کاروباری معاملات کا بھی صرف بل ہیریسن، ہیلن ایلیس اور اسکے وکیل ہنری بر جس کو ہی علم تھا۔ ان کے علاوہ اسکا کوئی ذاتی دوست نہیں تھا۔

شائد اسی وجہ سے کبھی کسی نے اس سے اسکی ذاتی زندگی کے بارے میں سوال نہیں پوچھے تھے۔ اسکے بارے میں جو کچھ مشہور تھا وہ زیادہ تر اسطرح کی غلط افواہوں پہ مبنی تھا۔ کہ وہ یونانی تھا، ترکش تھا، منگول تھا، بدھ تھا، ہندو تھا۔ وہ کچھ عرصہ ٹیکساس میں رہا تھا۔ وہ ایریزونا(Arizona) میں ایک گریپ فروٹ فارم کا مالک تھا۔ لیکن جو اصل پوچھنے والا سوال تھا وہ کبھی کسی نے نہ پوچھا۔ کہ یہ افغانی جس کا اصل نام ظریف خان ہے وہ کیسے لوئی تمالے کے نام پر شیریڈن میں میکسکن کھانے بیچ رہا ہے اور تھوڑی بہت دولت جمع کر رہا ہے؟

اس بارے میں کئی نظریے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ امریکہ آنے سے پہلے وہ میکسیکو میں باورچی تھا اور پھر وہاں سے نقل مکانی کرکے ویامنگ آگیا۔ کچھ لوگ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ پہلے سان فرانسسکو آیا تھا جہاں اسنے اسپینش تارکینِ وطن سے تمالے پکانے کا فن سیکھا۔ لیکن اصل حقیقت یہ تھی کہ نہ وہ کبھی ٹیکساس گیا تھا نہ ہی اسنے تمالے پکانے کا فن اسپینش تارکینِ وطن سے سیکھا تھا۔ دراصل ظریف خان کو لوئی تمالے بنانے کے پیچھے ترکِ وطن، محنت مزدوری اور کھانا پکانے کا فن سیکھنے کی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ یہ افغانی تارکین وطن کی ایک بڑی تعداد کی کہانی ہے۔ جو ۱۹۰۰ء اور ۱۹۲۰ء کے دوران ویامنگ سے لیکر الاسکا تک امریکہ کی سبھی مغربی ریاستوں کے چھوٹے شہروں کی سڑکوں پر تمالے بیچنے کا روبار کرتے تھے۔

تمالے بہت قدیم خوراک ہے۔ شاید حضرت عیسیٰ، بلکہ سکندر سے بھی پہلے کی۔ یہ غالباً وسطی امریکہ کی مایا تہذیب کے شکاریوں، فوجیوں اور مسافروں کی ساتھ باندھ کر لیجانے والی پسندیدہ خوراک تھی۔ جب یورپ کے لوگ وہاں پہنچے تو یہ سارے وسطی امریکہ اور میکسیکو میں عام ملتی تھی۔ یہ ۱۸۸۴ء تک امریکہ میں عام نہیں ہوئی تھی۔ چناچہ اس سال ایسوسی ایٹڈ پریس نے ایک بار اسکا تذکرہ یوں کیا کہ یہ کھانے کی ایک انوکھی قسم ہے جو اپنے علاقے میں بہت

مقبول ہے۔

دس سال بعد تمالے امریکہ کی پسندیدہ نئی خوراک بن چکی تھی اور ہر کوئی اسکا دلدادہ تھا۔ گستاوو آریلینو نے اپنی کتاب 'ٹاکو یو ایس اے' میں لکھا ہے کہ امریکہ میں تمالے کھانے کا شوق تب پڑا جب سان فرانسسکو میں رابرٹ ایچ پُٹ مین نے 'کیلیفورنیا چکن تمالے' نام کی کمپنی کھولی۔ تمالے بیچنے کا خیال اسے سڑکوں پر ریڑھی لگا کر تمالے بیچنے والوں کی مقبولیت کو دیکھ کر آیا تھا۔ فیشن کے بارے میں وہ شاید دوائیاں بنانے والی کمپنیوں سے متاثر تھا۔ کیونکہ اسکی کمپنی کے تمالے بیچنے والے سر سے پاؤں تک سفید لباس میں ملبوس ہوتے تھے۔ انکے ہیٹوں اور ٹوکریوں پر کمپنی کا نشان چسپاں ہوتا تھا۔ ٹوکریوں کے نیچے آگ، درمیان میں اُبلتا پانی اور اسکے اوپر اُبلے ہوئے تمالے پڑے ہوتے۔ جنہیں وہ چل پھر کر بیچتے تھے۔ ۱۸۹۳ء میں پُٹ مین اپنا تمالے بیچنے کا کاروبار شکاگو لے گیا جہاں اس سال کے عالمی میلے میں انہیں بہت پذیرائی ملی۔

ریڑھیوں پر دوسرا سامان بیچنے کی طرح، تمالے کی ریڑھی لگانے پر بھی بہت کم لاگت آتی تھی۔ اسی لیے تارکینِ وطن اور دوسرے لوگوں کے لیے یہ کام اسان تھا۔ نیویارک شہر میں آئرش اور اٹالین تمالے بیچتے تھے۔ اور وسطی ریاستوں کے شہروں میں زیادہ تر کالے امریکن تمالے کی ریڑھیاں لگاتے تھے۔ لیکن راکی ماؤنٹین اور مغربی علاقوں میں افغانی اس کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ خصوصاً وہ افغانی جن کا خاندانی نام خان تھا (یہ سب آپس میں رشتے دار نہیں تھے۔ دراصل افغانستان میں خان نام بہت عام ہے)۔ بیسویں صدی کی پہلی دو دہایوں کے دوران، تمالے بیچنے والے افغانی خان ہر جگہ پائے جاتے تھے: ڈیڈووڈ، فارگو اور رینو میں؛ سیاٹل، سپوکین اور واشنگٹن میں؛ مونٹانا ریاست کے شہر بیوٹے میں جہاں ۱۹۱۳ء میں اٹھارہ افغانی تمالے بیچنے والے تھے۔ اور اسکے علاوہ ریاست کے باقی شہروں فلیٹ ہیڈ، فورڈ بینٹن، سلوربو، اناکونڈا، ہاورے، گریٹ فال، ریڈ لاج، مائیلز سٹی، چنوک اور بیلنگ میں بھی تھے۔ ۱۹۰۸ء کے بعد سے الاسکا میں تمالے بیچنے والوں میں بہادین خان، حبیب خان، اور ایم خان کے علاوہ ایک اور شخص تمالے جو (Tamale Joe) بھی تھا، جس کا اصل نام بھی غالباً خان تھا۔

مغربی ریاستوں کے سب تمالے بیچنے والے افغان نہیں تھے اور نہ ہی ہر افغان تمالے بیچتا تھا۔ ان میں ایک چھوٹی تعداد چلّی بیچنے والوں کی تھی۔ جیسے کہ ظریف خان نے بعد میں اپنے ریستوران میں چِلّی بھی بیچنی شروع کر دی تھی۔ (سیاٹل کہ ایک ریڑھی والے دولہا جافا خان نے ۱۹۱۶ء میں چِلّی فروخت کرنے سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ کچھ دیر بعد اسنے ایک چِلّی پارلر کھول لیا۔ بعد میں اپنا نام تبدیل کر کے جوزف جوفری کر لیا۔ جوفری بیلے (Joffrey Ballet) کا قیام اسی کے بیٹے رابرٹ کا کارنامہ ہے)۔ لیکن تمالے کا کاروبار افغانوں کی پہچان بن گیا تھا۔ جیسے کافی ترکوں کی پہچان ہے، قالین شامیوں کی اور قیمتی اشیاء گروی رکھ کے قرض دینا یہودیوں کی۔

تمالے فروشوں کی ایک اور وجہ شہرت انکا آپس میں مستقل لڑائی جھگڑا تھا۔ اس جھگڑے میں صرف افغان ہی ملوث نہیں تھے۔ جتنا عرصہ لوگ تمالے کھانے کے شوقین رہے، سارے ملک کی اخباروں میں یہ جھگڑے اسطرح کی مذاقیہ سرخیوں کی زینت بنتے رہے کہ۔ ''شہر میں جو گرما گرم تمالوں کی لڑائی چھڑی ہوئی ہے، وہ کل شام اپنی انتہا تک پہنچ گئی۔'' کولوراڈو سپر نگز کے اخبار ویکلی گزٹ نے ایک بار یہ سرخی لگائی کہ۔'' دو مخالف تمالے فروشوں میں گولی

چل گئی۔ ہیری رزنر نام کا لڑکا بازو میں گولی لگنے سے زخمی ہو گیا۔" ۱۹۱۰ء میں مونٹانا میں سلوا گورا (بُل ڈاگ) ڈیمیسیلی نے میرینو نام کے ایک شخص کو تمالے کی کاروباری رقبت کی وجہ سے قتل کر دیا۔ تمالے کے افغانی کاروباریوں میں سب سے زیادہ لڑائیاں سیاٹل میں ہوئیں۔ وہاں پہ تمالے کے کاروبار پہ ایک خان چھایا ہوا تھا جس کی ایک مافیا کے سردار کی سی دہشت تھی۔ بالآخر غالباً کسی تمالے کی ریڑھی لگانے والے نے اسے پیچھے سے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اگر اس کا مقصد تمالے کے کاروباری جھگڑے ختم کرنا تھا تو اسمیں کامیابی نہ ہوئی۔ دس سال بعد بھی سیاٹل سٹار اخبار میں تمالے بیچنے والوں کی ایک دوسرے کے خلاف انتقامی کاروائیوں کی خبریں چھپتی رہیں۔

ان سب باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظریف خان سیاٹل سے شیریڈن کیسے پہنچا۔ جبکہ سیاٹل میں شیریڈن اور وہاں تمالے کے کاروبار کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا۔ سننے میں آیا ہے کہ جب ظریف خان امریکہ پہنچا تو اس کے ہموطنوں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔ وہ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں نکل پڑا جہاں تارکینِ وطن کم ہوں۔ یہ بات درست بھی لگتی ہے کیونکہ جب ظریف خان سیاٹل پہنچا تو ان دنوں وہاں افغانیوں کے آپس میں جھگڑے چل رہے تھے۔ اگر آپ بھی اس کی جگہ ہوتے اور اسی کی طرح امریکہ میں اور تمالے کے کام میں نئے اور اپنے کام سے کام رکھنے والے امن پسند ہوتے۔ تو آپ بھی اپنے رہنے کے لیے ویامنگ کی طرح کسی دور دراز کی ریاست کا کوئی چھوٹا شہر تلاش کرتے۔

خاندانی روایات کے برخلاف، ایسا نہیں ہوا کہ ظریف خان اپنا تمالے بیچنے کا سامان لے کر شیریڈن میں وارد ہوا اور وہاں لوگوں کو پہلی بار تمالے سے متعارف کرایا۔ وہاں اسکا پیشرو آزید خان پہلے سے موجود تھا۔ آزید خان ۱۸۷۱ء میں افغانستان کے ایک گاؤں بہبودی میں پیدا ہوا۔ وہ شیریڈن کا پہلا تمالے بیچنے والا تھا۔ پہلی بار شہر کی بزنس ڈائرکٹری میں ظریف خان کا نام اسکے نائب کے طور پر لکھا گیا تھا۔ اگلے دس سال میں تین اور تمالے فروشوں اور ایک چِلّی فروش نے شیریڈن میں اپنا اڈہ جمایا۔ اُن سب کا نام خان تھا اور وہ نارتھ سکاٹ سٹریٹ کے ایک چھوٹے سے مکان میں مل کر رہتے تھے۔ لیکن ۱۹۲۳ء تک سوائے ظریف خان کے باقی سب شیریڈن سے جا چکے تھے۔ تمالے کا کاروبار بھی ختم ہو رہا تھا۔ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۶ء تک تمالوں کی فروخت چالیس لاکھ سالانہ سے گر کر چالیس ہزار رہ گئی تھی۔ اور شہروں کی سڑکوں سے تمالے فروش غائب ہونا شروع ہو گئے تھے۔

جن لوگوں نے اس زمانے میں یہ کاروبار چھوڑا، اُن میں ایک جرمن نژاد لوئی مینگے (Louis Menge) بھی تھا۔ ۱۹۱۰ء میں مینگے نے شیریڈن ڈیلی اینٹرپرائز میں اشتہار دیا کہ۔ "ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو گرم تمالے بیچنے کا کام سیکھنا چاہتا ہو۔" جب اسے اپنی جگہ لینے والا مل گیا تو وہ اپنی بیوی اور بچے کو لیکر کھیتی باڑی میں قسمت آزمائی کے لیے مونٹانا چلا گیا۔ دو سال بعد جب اسنے واپس ویامنگ کا چکر لگایا تو اسکی حالت بہت خراب نظر آتی تھی۔ کھیتی باڑی بہت محنت مشقت کا کام تھا۔ اوپر سے کھیت مزدوروں کی قلت اور بارش کی کمی کی وجہ سے اسے بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ شیریڈن پوسٹ نے اسکی آمد کی خبر دی تو ساتھ ہی پڑھنے والوں کو یاد کرایا کہ اچھے دنوں میں۔" شیریڈن کے لوگ مسٹر مینگے کو ہاٹ تمالے لوئی کے نام سے جانتے تھے۔"

اب مسٹر مینگلے کو کوئی نہیں جانتا۔ اسے کھیتی باڑی میں ناکامی ہوئی۔ بیوی اور بچہ اسکی زندگی میں ہی فوت ہو گئے۔ وہ خود بھی تنِ تنہا ییلوسٹون پُور فارم پہ وفات پا گیا۔ البتہ ہاٹ تمالے لوئی نام زندہ رہا۔ پہلے ہاٹ تمالے لوئی اور شیریڈن میں ابتدا میں تمالے کا کام کرنے والے خانوں کو سب نے بھلا دیا۔ سارے ملک میں تمالے کھانے کا شوق ختم ہو گیا۔ پر ظریف خان اپنے کام میں ڈٹا رہا۔ جیسا کہ تارکینِ وطن کا تجربہ ہے، وطن چھوڑنے والوں کی کہانی اکثر ایک نئی جگہ ٹِک کر بیٹھنے کی جدوجہد پر ختم ہوتی ہے۔

جب ظریف خان نے دوبارہ شہریت حاصل کرنے کی درخواست دائر کی، اسوقت اسے شیریڈن میں رہتے ہوئے تقریباً نصف صدی گذر چکی تھی۔ اسکی عمر ستر سال کے قریب ہو گئی تھی۔ شہریت کی درخواست پر اب اسنے اپنے بالوں کا رنگ بھورے کی بجائے سفید لکھا۔ اسکے چہرے کی رنگت پہلے کی طرح تھی۔ لیکن اب یہ اسکے شہری بننے میں رکاوٹ نہیں تھی۔ ۴ مئی ۱۹۵۴ء کو حکومت نے اسے وہ سارے شہری حقُوق دے دیے جو پہلے اس سے ہمیشہ کے لیے چھین لیے تھے۔

اس دوران ظریف خان کی کی زندگی میں ایک غیر معمولی تبدیلی آچکی تھی۔ ایک سال پہلے وہ پاکستان گیا اور وہاں شادی کر کے واپس آیا۔ شادی گھر والوں کی مرضی سے ہوئی تھی۔ اسکی بیوی فاطمہ خان (جو اسکی رشتہ دار نہیں تھی) پندرہ سال کی تھی۔ شہر کے لوگوں میں چہ میگوئیاں تو ہونی ہی تھیں لیکن انمیں تنقید سے زیادہ مذاق کا رنگ تھا کہ۔ "ہمیں نہیں پتہ تھا ظریف خان میں اتنی مردانگی ہے۔"

بظاہر ظریف خان میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اگلے گیارہ سال میں اسکے چھ بچے پیدا ہوئے۔ ظریف خان اپنے بچوں پر جان چھڑکتا تھا۔ اور اکثر وہ اپنی بڑی بیٹی روئینا کو گود میں لیے اور چھوٹے لڑکے ظریف کو بچہ گاڑی میں بٹھائے انہیں سیر کرواتا نظر آتا۔ ان بچوں نے مجھے بتایا کہ وہ جب بڑے ہوئے تو ظریف خان انہیں اپنے ریستوران لیجاتا اور کاؤنٹر پہ بٹھا کے پیسوں والا دراز کھولتا اور انہیں پیسے گننے سکھاتا۔ پھر اور بچے پیدا ہوئے۔ ایک لڑکی جسے ماں کا نام فاطمہ دیا گیا، پھر تیسری لڑکی زرینہ، پھر دوسرا بیٹا نذیر، اور آخر میں سب سے چھوٹی بیٹی مریم۔ ہر بچے کی پیدائش کے بعد وہ اسے اور اپنے سارے خاندان کو رشتہ داروں سے ملوانے پاکستان لیجاتا۔

۱۹۶۳ء میں مریم کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد، ظریف خان ایک بار بھی ساری فیملی کو لے کر باڑہ آیا۔ اسبار بچی کو باقی خاندان سے ملوانے کے علاوہ اسے ایک اور ضروری کام بھی تھا۔ دوسرے تارکینِ وطن کی طرح وہ بھی ساری زندگی گھر پیسے بھجواتا رہا تھا۔ کبھی اپنے علاقے میں کنویں کھدوانے اور مسجدیں بنوانے کے لیے۔ جہاں پہلے نہ مسافروں کو پینے کا پانی میسر تھا نہ عبادت کرنے کے لیے مساجد تھیں۔ یا پھر رشتہ داروں کے لیے مکان اور زرعی زمین خریدنے کے لیے۔ اب اس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے مکان اور زمینیں قانونی طریقے سے ان رشتے داروں کے نام لگوا دے جو وہاں رہ رہے تھے اور باقیوں میں نقد رقم تقسیم کر دے۔

اس کے بچوں کا کہنا ہے کہ اسی سلسلے میں اسکا اپنے آوارہ اور بدمعاش رشتے کے پڑپوتے سلطان خان سے جھگڑا ہو گیا۔ سلطان خان جب سولہ سال کا تھا تو اس سے ایک سنگین جرم سرزد ہوا تھا۔ ظریف خان نے بھاری رقم دے کر اسکی جان چھڑوائی اور اسے ایک پرائیویٹ سکول میں داخل کروا دیا۔ لیکن وہاں بھی اسکی اصلاح نہ ہو سکی۔ اب وہ تیس سال کا ہو چکا تھا۔ ظریف خان نے اسے رقم یا

جائیداد دینے سے انکار کر دیا۔ سلطان خان اس بات پر آگ بگولہ ہو گیا اور دھمکیاں دینے پر اتر آیا۔ پر ظریف خان اپنے ارادے پر ڈٹا رہا۔

اگلے دن صبح ظریف خان اپنے ایک اور پڑپوتے کو لے کر کسی کام کے لیے نزدیک کے گاؤں جانے کے ارادے سے اپنی پرانی عادت کے مطابق پیدل گھر سے روانہ ہوا۔ آدھے راستے میں سلطان خان چاقو لے کر اسکے انتظار میں چھپا بیٹھا تھا۔ یہ ۲۳ جون ۱۹۶۴ء کا واقعہ ہے۔ ظریف خان کی عمر اسی سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ ان صحت مند بوڑھوں میں سے تھا جنہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ ابھی انکی زندگی کے بہت سال باقی ہیں۔ اس سال کے شروع میں لی گئی ایک تصویر میں ظریف خان نے اپنے نوزائدہ بچے نذیر کو گود میں بٹھایا ہوا ہے۔ ساتھ اسکی بیوی اور دوسرے بچے کھڑے ہیں۔ سب سے بڑا بچہ دس سال کا، دوسرا آٹھ سال کا اور اس سے چھوٹا سات سال کا۔ باقی اتنے چھوٹے تھے کہ باپ کی یادیں ابھی ان کے ذہن پر نقش نہیں ہوئی تھیں۔ اسکا انہیں موقع بھی نہ ملا۔ سلطان خان نے پہلے اپنے کزن کو قتل کیا۔ پھر ظریف خان پر چاقو کے سات وار کیے۔ ظریف خان نے اس راستے کی مٹی پر گر کر اپنی جان دیدی جسکی اسکی زندگی میں بہت اہمیت تھی۔ یہ اسکے گاؤں سے باہر جانیکے راستے کی مٹی تھی۔

ظریف خان کی سوگوار فیملی کو جب اسکی وصیت کا پتہ چلا تو وہ حیران رہ گئے۔ اسکے اکاؤنٹنٹ اور وکیل کے علاوہ کسی کو بھی، حتیٰ کہ اسکی بیوی کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ اتنا امیر ہے۔ اسکی وصیت سے پتہ چلا کہ وہ پانچ لاکھ ڈالر کا مالک تھا۔ جنکی اسوقت کی قوتِ خرید آج کے چالیس لاکھ ڈالر کے برابر تھی۔ اتنی ہی رقم اسکے پاس پاکستان میں بھی تھی۔ شائد اس ڈر سے کے اسکی بیوی اسکے بعد کسی اور سے شادی کر لے گی، اسنے اپنی وصیت میں ساری دولت ہر بچے کے لیے الگ ٹرسٹ بنا کر انکے نام کر دی تھی۔ اور بیوی کے لیے صرف دس ہزار ڈالر اور ماہوار خرچہ چھوڑا تھا۔ ویامنگ کے قانون کے مطابق بیوی زیادہ ورثے کی حقدار تھی۔ جس کے لیے اسنے ایک وکیل کی مدد سے مقدمہ دائر کر دیا۔ آخرِ کار نصف ورثہ اسے مل گیا۔

یوں ظریف خان کے مرنے کے بعد اسکی فیملی کا نیا دور شروع ہوا۔ فاطمہ کی عمر اسوقت چھبیس سال تھی۔ اُس کے اوپر دس سال سے کم کے چھ بچے پالنے کی ذمہ داری تھی۔ وہ ان پڑھ تھی۔ کبھی اکیلے گھر سے باہر پاؤں نہ نکالا تھا۔ اسنے اپنا ایک بھائی اور بھتیجا پاکستان سے منگوا لیے۔ پھر ظریف خان جیسی خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوے اسنے یہ حساب لگایا کہ ان حالات میں وہ شریڈن میں اپنی زندگی کو کیسے بہتر بنا سکتی ہے۔ اسنے انگریزی لکھنا پڑھنا سیکھنے کے لیے ایک ٹیوٹر رکھ لیا۔ اور پی ٹی اے کی ممبر بن گئی۔ ڈرائیونگ بھی سیکھ لی۔ اسے بھی اسی دن ڈرئیونگ لائسنس ملا جس دن اسکی بڑی بیٹی کو ملا۔ دو سال بعد اسنے شیریڈن کا جے ای موٹل اور کیفے خرید لیا۔ اسدن سے اسکا خاندان ہوٹلنگ کے بزنس میں ہے۔ اور وہ ایک طرح سے ظریف خان کے نقشِ قدم پر ہی چل رہے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فاطمہ کے مزید رشتہ دار بھی پاکستان سے آ گئے۔ اسکے بچوں کی شادیاں ہو گئیں اور بچے پیدا ہوئے۔ انہوں نے بھی اپنے اور رشتہ داروں کو پاکستان سے بلوا لیا۔ جنہوں نے یہاں آ کر شادیاں کیں اور بچے پیدا کیے۔ جو اب خود بھی شادی شدہ ہیں۔ انکے خاندان کی تعداد کئی گُنا بڑھ گئی اور وہ مختلف شہروں میں بکھر گئے۔ ۲۰۰۳ء میں فاطمہ کے ایک بھائی نے جیلیٹ

جا کر وہاں ایک ہوٹل کھولا۔ اب خاندان کی وہ برانچ گیارہ ہوٹلوں کا مالک ہے۔ اس بھائی کے بچے بھی شادی شدہ اور بال بچوں والے ہیں۔ ظریف خان کا خاندان اب ڈیڑھ دو سو افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں سے زیادہ تر ویامنگ میں ہی رہتے ہیں لیکن کچھ نقل مکانی کر کے ساؤتھ ڈکوٹا، کولاراڈو اور دوسری ریاستوں میں آباد ہیں۔ جیسا کہ سب خاندانوں میں ہوتا ہے، ان کی آپس میں ایسی باتوں پر ناراضگیاں بھی ہوئیں۔ کہ کس نے زیادہ دولت کمائی ہے، کسے زیادہ عزت اور پیار ملتا ہے، کس نے کس کے جذبات کا خیال نہیں کیا، وغیرہ۔ پھر بھی زیادہ تر گھروں کا آپس میں اچھا ملنا جلنا ہے۔ اور وہ عیدوں، بچوں کی پیدائش اور شادیوں پر، اور جنازوں پر، اکٹھے ہوتے ہیں۔

جیلیٹ میں جن لوگوں نے پیسے اکٹھے کر کے مسجد بنائی تھی، ان میں ظریف خان کے خاندان کے لوگ بھی شامل تھے۔ انکے لیے بڑی حیرت اور صدمے کی بات تھی کہ انکو بھی دھمکیاں دی گئیں۔ انہیں اس سے پہلے کبھی ویامنگ میں اس طرح کی نفرت کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ خصوصاً ظریف خان کی شیریڈن میں جو عزت اور احترام تھا۔ اسکی وجہ سے اسکے بچوں کو کبھی اس نسلی منافرت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا جس سے سفید فام لوگوں کی اکثریت والے اس شہر میں دوسرے غیر ملکیوں کو واسطہ پڑتا تھا۔ زرینہ جو اب شیریڈن کے ہالی ڈے لاج کی مالک ہے۔ اسکا کہنا ہے کہ۔ "ہم نے اس شہر میں بہت اچھے ماحول میں زندگی گزاری۔ ہمارے بہت سے دوست تھے۔ کبھی کسی نے ہماری جلد کی رنگت پر انگلی نہیں اُٹھائی۔ نہ کبھی کسی نے ہمارے مذہب کے بارے میں سوال کیا۔ نہ یہ پوچھا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں۔" ظریف خان اور اسکے خاندان کو شیریڈن کے لوگ اپنوں میں ہی سمجھتے تھے۔ زرینہ نے بتایا کہ نائن الیون کے واقعے کے فوراً بعد انکا یہودی ڈاکٹر انکی خیریت معلوم کرنے دوڑا چلا آیا تھا۔ نائن الیون کے بعد بھی انکے ساتھ سلوک میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور انہیں کسی لڑائی جھگڑے یا نفرت کا سامنا نہیں ہوا۔

لڑائی تو 'جیلیٹ کو اسلام سے بچاؤ' کے بانی بریٹ کیلون نے شروع کی۔ وہ اسوقت اُنچاس سال کا تھا۔ اسکی نشو نما ویامنگ کے ایک فارم پر ہوئی تھی۔ سکول پاس کرنے کے بعد وہ گھر سے چلا گیا۔ اور فوج میں میرین (Marine) کے طور پر بھرتی ہو گیا۔ وہاں وہ اگلے دس سال رہا۔ پھر کچھ عرصہ سیکیوریٹی گارڈ کا کام کیا، جھینگے پکڑنے کے کام میں قسمت آزمائی کی اور بعد میں کچھ دیر تیل اور میتھین کے کنوؤں پر کام کرتا رہا۔ ان دنوں تیل کی قیمت گر گئی ہے۔ جس سے جیلیٹ کی اقتصادی حالت پر بُرا اثر پڑا ہے۔ بیروزگاری بہت بڑھ گئی ہے۔ فاسٹ فوڈ کی دکانوں پہ بھی کام ملنا مشکل ہے۔ گذارے کے لیے کیلون کمپیوٹر اور سیل فون کی مرمت کا کام کر رہا ہے۔

اب اسکے پاس انٹرنیٹ دیکھنے کے لیے بہت فارغ وقت ہے۔ مسجد کے بارے میں بھی اسے انٹرنیٹ سے علم ہوا۔ اسی نے مسجد کے خلاف احتجاج کے لیے لوگوں کو اکٹھا کیا۔ اور مسجد کو مستقل طور پر بندوق کے نشانے پر رکھنے کی دھمکی دی۔ اسنے شہر کے مسلمانوں کو بھی مختلف بہانوں سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ جب اسے پتہ چلا کہ جیلیٹ میں اسلام کے بارے میں ایک لیکچر دینے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ تو اسنے انٹرنیٹ پہ ایک پوڈکاسٹ (podcast) بنا کر دھمکیاں نشر کرنی شروع کر دیں کہ وہ لیکچر ہال میں جا کر مسلمانوں کو مزہ چکھائے گا۔ دوسروں سے بھی اپیل کی کہ مسلمانوں کو اس شہر سے بھگانے میں اسکا ہاتھ بٹائیں۔ اسکی دھمکیاں اتنی خطرناک ہو گئیں کے ایف بی آئی کو مداخلت کرنی پڑی۔

ظریف خان کے خاندان کی طرح کیلون کا خاندان بھی لمبے عرصے سے امریکہ کے مغربی علاقے میں آباد ہے۔ لیکن وہ امریکہ کی سوسائٹی کے ایک دوسرے رُخ کی نمائندگی کرتا ہے۔ کیلون نے مجھے بتایا کہ۔ "میرے باپ دادا اس زمانے سے ویامنگ میں رہ رہے ہیں جب یہاں گھوڑا گاڑیوں پہ سفر ہوتا تھا۔ میرا پڑدادا فوج کے لیے پانچ ڈالر فی کس کے حساب سے ریڈ انڈینز کو بندوق کی گولی سے قتل کیا کرتا تھا۔" نئے آنے والوں کی پرانے رہائشیوں کو جبر و تشدد کے سے نکالنے کی یہی وہ تاریخ ہے جسکی وجہ سے کیلون مسلمانوں سے خوف زدہ ہے۔ اسکا خیال ہے کہ مسلمان امریکہ پر پُر تشدد حملہ کرکے قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ اسکی ذاتی ذمہ داری ہے کہ انکا مقابلہ کرے۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ وجہ تھی کہ اس نے مسجد کے بارے میں تحقیقات کی۔ اس نے کہا کہ۔ "میں ان لوگوں میں سے ہوں جو عملی اقدام کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ میں نے جا کر زور زور سے مسجد کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ان لوگوں سے پوچھا کہ وہ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور ان کے ارادے کیا ہیں؟۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ ان کا تعلق خان فیمیلی سے ہے۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ خان ہیں۔"

خان کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، اور یہاں کیا کر رہے ہیں۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ یہ امریکہ کی اصل کہانی ہے۔ بڑی حد تک اس ملک کی تاریخ تارکینِ وطن نے ہی ترتیب دی ہے۔ گو یہ سوال ہمیشہ سے ہماری تاریخ کا حصہ رہا ہے کہ کون امریکہ کا شہری کہلانے کے لائق ہے اور کون نہیں۔ ظریف خان کو اسکی جلد کی رنگت کی بنا پر امریکہ کا پورا شہری بننے کے قابل نہ سمجھا گیا تھا۔ نوے سال کے بعد، جب کے مسلمانوں کی امریکہ میں موجودگی کو ایک بڑا مسئلہ سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ اسکی اولاد اپنے مذہبی عقیدے کی وجہ سے امریکی کہلانے کے لائق نہیں ہے۔

بار بار ہمیں بھول جاتا ہے کہ امریکی ہونے کی اساس کیا ہے۔ امریکی قوم کی تشکیل اس انقلابی نظریے پر ہوئی تھی کہ مختلف رنگ و نسل کے لوگ ایک قومی سانچے میں ڈھل سکتے ہیں۔ لیکن ہماری ہر نئی نسل میں ہر بار یہ سوال اُٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ کسے اپنی قوم میں شامل کیا جائے اور کن لوگوں کو باہر رکھنے کے لیے حقیقی یا خیالی دیواریں کھڑی کی جائیں۔ یہ طے کرنے کے لیے ہم اپنے ماضی کو پیمانہ بناتے ہیں۔ پر یہ بھول جاتے ہیں کہ ماضی میں ہماری قوم اس سے کہیں زیادہ متنوع رہی ہے جتنا کہ اب ہمارا خیال ہے کہ وہ تھی۔

اس زمانے میں جب ابھی شیریڈن کی کچی سڑکیں مٹی اور گرد سے اٹی پڑیں تھیں۔ ظریف خان نام کا ایک مسلمان جو ابھی نوجوان ہی تھا۔ اور امریکہ کے اس ویران مغربی علاقے میں میکسیکن کھانے بیچ کر اپنا پیٹ پال رہا تھا۔ وہ ایک تمالے کی شرط لگا کر مقامی کاؤبوائز کیساتھ ننگے پاؤں مین اسٹریٹ پر دوڑ لگانے کا مقابلہ کیا کرتا تھا۔

تاریخ نے ابھی اپنا فیصلہ نہیں سنایا کہ جیتا کون؟

From: The New Yorker, June 6 & 13, 2016)

پروفیسر ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہد صاحب کی چند خوشگوار یادیں

انجینئر محمود مجیب اصغر، ربوہ

پروفیسر ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہد صاحب پی ایچ ڈی (کیمسٹری)

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے نامور اور ہر دلعزیز اساتذہ میں سے تھے۔ جس زمانے میں خدا تعالیٰ نے مجھے تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں ایف ایس سی (پری انجینئرنگ) کرنے کا موقع دیا اس وقت آپ واحد پی ایچ ڈی پروفیسر تھے۔ وقف کی روح کے ساتھ آپ حضرت صاحبزادہ حافظ مرزا ناصر احمد صاحب پرنسپل کے خاص معتمدین میں سے تھے۔

آپ کی لکھی ہوئی کیمسٹری کی کتاب ہماری ٹیکسٹ بک ہوا کرتی تھی۔ آپ نے یہ کتاب پروفیسر عبدالکریم صاحب کے ساتھ ملکر تصنیف کی تھی جو گورنمنٹ کالج لاہور میں کیمسٹری کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ تھے۔ آپ اگر واقف زندگی نہ ہوتے تو اس کوالیفیکیشن اور قابلیت کے ساتھ کسی دوسرے ادارے میں کئی گنا زیادہ تنخواہ لے سکتے تھے۔ لیکن آپ نے دین کو دنیا پر مقدم رکھتے ہوئے وقف کو آخری وقت تک نبھایا۔ کیونکہ آپ کے والد صاحب نے آپ کی پیدائش سے پہلے آپ کو وقف کیا ہوا تھا۔

کالج کے ایام اور میری یادیں

حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ کے مولد و مسکن بھیرہ سے 1960 میں میٹرک کرکے میں نے تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں

داخلہ لیا۔ میرے بڑے بھائی مکرم محمد عبد الطیف شاہد صاحب وہاں بی ایس سی (فائنل) کے طالبعلم تھے۔ انہوں نے سرپرست کے طور پر میرا انٹرویو اور داخلہ کروایا۔ جب کلاسیں شروع ہوئیں تو کیمسٹری کا مضمون پڑھانے کے لیے پروفیسر سلطان محمود شاہد صاحب مقرر ہوئے۔ آپ کو عموماً ڈاکٹر ایس ایم شاہد یا شاہ صاحب کہا جاتا تھا۔ آپ بڑی منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ مسکراتا ہوا گول چہرہ کوٹ پتلون میں ملبوس نیکٹائی لگائے ہوئے اوپر کالے رنگ کا گریجویٹ گاؤن اور کالی ٹوپی پہنے ہوئے۔ کالج کی روایات میں اساتذہ کے لیے گریجویٹ گاؤن اور طلباء کے لیے انڈر گریجویٹ گاؤن پہننا لازمی تھا۔ اور اسکے ساتھ سر پر کالی ٹوپی۔ جس میں پروفیسر اور طلباء بہت بھلے لگتے تھے۔

کیمسٹری کا مضمون بظاہر خشک اور مشکل تھا۔ اور شروع میں لیکچر کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ آپ نے بتایا کہ کالج سے واپس جا کر کئی بار لیکچر دوہرایا کریں چنانچہ آپ نے ایسی حکمت اور سلیقے سے یہ مضمون پڑھایا کہ بہت جلد سمجھ آنے لگی۔ اسوقت فرسٹ ائیر کا internal examination ہوتا تھا۔ جب فرسٹ ائیر کا رزلٹ آیا تو میرے جیسا backbencher بھی انکے مضمون میں اول آگیا اور یہ محض خدا کا فضل تھا۔ لیکن جب سیکنڈ ائیر کی کلاسیں شروع ہوئیں تو شاہ صاحب کو بی ایس سی کی کلاسوں کو پڑھانے کے لیے لگا دیا گیا۔ اور ہمیں پڑھانے کے لیے پروفیسر مبارک احمد انصاری صاحب مقرر ہوئے۔

اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے ڈاکٹر ایس ایم شاہد صاحب کئی غیر نصابی سرگرمیوں (extracurricular activities) کے بھی نگران تھے۔ چنانچہ کالج یونین کے آپ سرپرست تھے۔ اسی طرح اسپورٹس میں غالباً فٹبال کے صدر تھے۔ غرض کالج میں آپ نے بڑی مصروف اور بھرپور زندگی گزاری۔ ہر طالبعلم بے تکلفی سے آپ سے اپنے مسائل ڈسکس کر سکتا تھا۔ آپ نہایت ہمدرد انسان تھے۔ ہر ایک کی راہنمائی فرماتے۔

کالج کا شاندار دور

حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کے پرنسپل شپ کے زمانے میں شاہ صاحب جیسے لائق اور مخلص اور بے نفس پروفیسروں کی بدولت کالج کا معیار بہت اعلیٰ تھا۔ رزلٹ بہت اچھے آتے تھے۔ چنانچہ جب ہم نے 1962ء میں ایف ایس سی کی تو خدا کا یہ خاص فضل ہوا کہ پانچ طلباء کو میڈیکل کالج میں اور سات طلباء کو انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ میں بھی ان خوش نصیبوں میں سے ایک تھا۔ اس طرح limelight میں آنے کی وجہ سے شاہ صاحب مجھے بھی جاننے لگے۔ اور بعد میں عملی زندگی میں بھی یہ جان پہچان قائم رہی۔

میں سمجھتا ہوں کہ وہ دور کالج کا بہترین دور تھا۔ جب حضرت مرزا ناصر احمد صاحب پرنسپل اور شاہ صاحب جیسے لائق اور ذہین اساتذہ ہوا کرتے تھے۔ 8 نومبر 1965ء کو حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کو خدا تعالیٰ نے مسند خلافت پر بٹھا دیا جس سے بظاہر کالج میں ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ لیکن شاہ صاحب جیسے مخلصین کی ٹیم کی بدولت اسی momentum سے کالج رواں دواں رہا۔ اور اس دور میں بھی شاندار نتائج نکلتے رہے۔

اصحاب کہف کا دور

اسکے بعد ذوالفقار علی بھٹو کی جب حکومت آئی تو 1972 میں کالج قومیا لیا گیا۔ اور جماعت کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ چند واقف زندگی پروفیسروں کو حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے کالج سے استعفیٰ دلوا کر جماعت کے کاموں میں لگا دیا۔ تاہم ڈاکٹر سلطان محمود شاہد

صاحب ان پروفیسروں میں شامل رہے جنہیں کالج میں continue رکھنے کا ارشاد تھا۔ اسکے بعد شاہ صاحب جیسے قابل قدر پروفیسروں کو اپنی ریٹائرمنٹ تک اصحاب کہف کا زمانہ دیکھنا پڑا۔ چھوٹی چھوٹی جگہوں پر بار بار ٹرانسفر ہوئے۔ Juniors کے ماتحت کام کرنا پڑا۔ لیکن آفرین ہے شاہ صاحب اور انکے دیگر ساتھیوں پر جنہوں نے نہایت صبر و تحمل اور استقامت سے ان حالات کا سامنا کیا۔

ایک بار انہیں حالات میں اتفاقاً شاہ صاحب سے مسجد نور راولپنڈی میں ملاقات ہوگئی۔ حال احوال پوچھنے پر مسکراتے ہوئے بتایا کہ ایک شاگرد میرا پرنسپل لگا ہوا ہے۔ اور وہ کہتا ہے کہ آپ آکر تنخواہ لے جایا کریں۔ صرف دستخط کرنے کے لیے کالج جانا پڑتا ہے۔ اس ساری تلخی کو آپ نے اپنی مسکراہٹوں کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔

اصحاب کہف کی دعا

قران کریم میں اصحاب کہف کی جو دعا مذکور ہے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے قلمی نوٹس سے یہاں اسکا ترجمہ پیش کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔

"اے واحد و یگانہ رب! ہم صرف تیرے
ہی بندے ہیں۔ صرف تجھ پر ہمارا توکل ہے۔ اور
تجھ ہی سے ہم دعا کرتے ہیں کہ تنگی اور ظلم کے
ان ایام کو دور فرما اور آزادی اور کامیابی کا راستہ
نکال۔"

زبان حال سے یہی کیفیت شاہ صاحب کی تھی۔ اور اسی کیفیت میں ریٹائرمنٹ تک آپ نے بڑی دلیری اور بشاشت سے خدا کے لیے زندگی گزاری۔ اور کبھی شکوہ نہ کیا۔ آپ اعلیٰ اداروں میں پڑھے ہوئے تھے۔ علیگڑھ یونیورسٹی سے ایم ایس سی اور یونیورسٹی آف لندن سے پی ایچ ڈی اور Post Doctorate کیا ہوا تھا۔ آپ Royal Institute of Chemical Society کے فیلو تھے۔ ایسے عظیم شخص کو بھی وہ زمانہ دیکھنا پڑا کیونکہ آپ احمدی مسلک پر تھے۔

سیرت کے چند واقعات

خلافت کا آپ کو بڑا احترام تھا۔ ایک بار اسلام آباد کے بیت الفضل گیسٹ ہاؤس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ تشریف لائے ہوئے تھے۔ ایک نماز کے بعد شاہ صاحب کی حضرت صاحب سے ملاقات کا میں نے ایک عجیب scene دیکھا۔ حضرت صاحب اسی کالج کے زمانے والی بے تکلفی سے سوال کررہے تھے۔ اور شاہ صاحب عزت و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسکرا مسکرا کر بڑی عقیدت اور بڑے محتاط انداز میں جواب دے رہے تھے۔ وہ بڑا پیار scene تھا جو میں نے دیکھا۔

ایکبار سرگودھا ایکسپریس پر انکے ساتھ لاہور سے ربوہ سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ راستے میں اپنے لندن میں تعلیم کے دوران بعض واقعات سناتے رہے۔ اور ضمنی طور پر آپ نے یہ واقعہ بھی سنایا کہ لندن میں قیام کے دوران خاندان مسیح موعودؑ کے ایک فرد کو آپ نے کسی بات پر جوش میں آکر کہہ دیا کہ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ رشتے دار ہونے کی وجہ سے آپ کو زیادہ احترام ہے۔ میں خدا کے فضل سے اپنے دل میں خلیفہ ءوقت کے لیے زیادہ محبت اور احترام کے جذبات رکھتا ہوں۔

آپ کی سیرت کا ایک نمایاں پہلو بشاشت تھا۔ کالج میں بعض اوقات آپ کلاس میں کوئی لطیفہ سنا دیا کرتے تھے۔ اور یہ بشاشت

آخری وقت تک قائم رہی۔ جب ہم لاہور سے ٹرین پر آرہے تھے تو ربوہ اسٹیشن پر اتر کر مسکراتے ہوئے یہ جملہ چست کیا کہ

"لوٹ کے بدھو گھر کو آئے"

آخری سالوں میں ایک بار air conditioned van پر لاہور سے ربوہ آتے ہوئے ان سے وین میں ملاقات ہوگئی۔ اسوقت بیمار تھے لیکن اسی مسکراہٹ اور بشاشت سے ملے۔ اس بات پر بہت خوش تھے کہ دنیا بھر میں میرے سینکڑوں شاگرد ہیں۔ اور بہت احترام اور عزت سے ملتے ہیں۔ دراصل یہ آپ کی شفقتوں کا نتیجہ تھا۔ کالج کے دوران بھی اور عملی زندگی میں بھی آپ اپنے طالبعلموں کی مدد اور راہنمائی کرتے تھے۔ یونیوسٹیوں میں داخلے لے کر دینا۔ وظائف اور سروس کے حصول میں بھی ممکنہ مدد فرماتے رہے۔ بہت شفیق اور ہمدرد انسان تھے۔ اسی لیے وہ شاگردوں سے مل کر خوش ہوتے تھے۔ علم سے بہت محبت تھی اور پڑھے لکھے شاگردوں کے ساتھ خاص لگاؤ تھا۔

قابل رشک سادہ زندگی

آپ کو علم سے محبت تو تھی ہی آخری وقت تک تدریسی سرگرمیاں بھی کسی نہ کسی طرح جاری رکھیں۔ لیکن آپ کی زندگی کا قابل رشک پہلو آپ کی سادہ زندگی ہے۔ ساری عمر سائیکل کو بطور سواری استعمال کیا آپ کو کبھی کار پر نہیں دیکھا۔ پبلک ٹرانسپورٹ پر سفر کرتے تھے۔ اور اسی میں خوش تھے۔ ساری زندگی میں ایک سادہ سا نامکمل مکان بنوایا۔

ایک بار جلسہ سالانہ ربوہ پر آپ لنگر خانہ نمبر 1 میں تشریف لائے۔ اس لنگر خانہ کے ناظم چوہدری مبارک مصلح الدین صاحب تھے۔ اور میں نے بھی وہاں ڈیوٹی لگوائی ہوئی تھی۔ آپ تشریف لائے اور خواہش ظاہر کی کہ گرم تازہ روٹیاں لینی ہیں۔ خاکسار انکے ساتھ تنوروں کی طرف گیا اور گرم روٹیاں اٹھا کر عرض کیا کہ کپڑا دیں اس میں لپیٹ دوں۔ انہوں نے کمال سادگی سے اپنی جھولی آگے کردی اور وقار کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہوئے چل دیے۔ آپ کی وفات پر میں نے یہ واقعہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ کی خدمت میں لکھ کر فیکس کیا۔ تو آپ نے اسے اپنے خطبہ جمعہ 8 مارچ 2013 میں آپ کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح بیان فرمایا۔

> "انکے بارہ میں مجیب اصغر صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ لنگر خانے میں پاکستان میں ڈیوٹیاں تھیں۔ تو ایک دفعہ یہ لنگر میں آئے۔ انکے کچھ مہمان آگئے تھے۔ روٹی لینی تھی۔ تو اِنہوں نے کہا اچھا۔ اور گرم گرم روٹیاں وہ دینے لگے تو انہوں نے کہا کپڑا لائیں۔ کپڑے میں روٹی ڈال دوں تو انہوں نے کہا کپڑا تو لایا نہیں۔ شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ قمیض کا پلو آگے کر دیا۔ کہ اس میں ڈال دو۔ اور لے کر چلے گئے۔ کوئی کسی قسم کا عار نہیں تھا۔ کہ میں اس طرح روٹی اٹھا کے جارہا ہوں۔ کیونکہ حضرت مسیح موعودؑ کے مہمانوں کو کھلانی تھی۔ اور اس لحاظ سے بڑی سادگی تھی۔
>
> اللہ تعالیٰ انکے درجات بلند فرمائے۔ مغفرت کا سلوک فرمائے۔" (خطبات مسرور جلد 11 صفحہ 163)
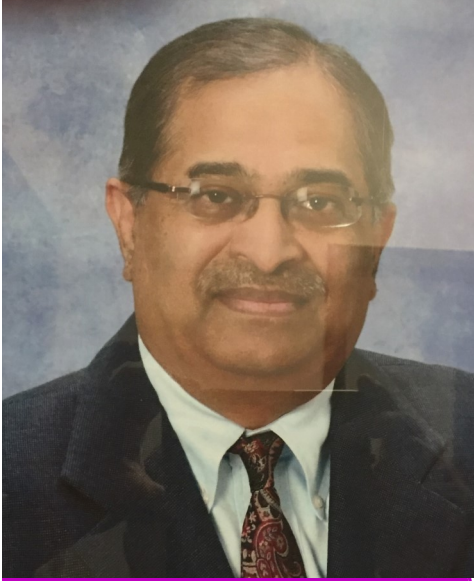
گاہے گاہے باز خواں۔۔۔ایں قصہ ءپارینہ را

آخری بنچ

ڈاکٹر نعیم صدیقی، کیلیفورنیا

1961ء

ایک دن اور ایک ایسا دن جو گاہے بگاہے یادوں کے صحن میں بہار کا دن بن کر آجاتا ہے۔

یہ وہ معصوم زمانہ تھا جب انسان خواب دیکھتا ہے، زندگی کی راہیں باہیں پھیلائے آپ کا انتظار کر رہی ہوتی ہیں۔

لیکن انسان ان سب باتوں سے بے خبر کسی تلاش میں رہتا ہے۔

کہاں جانا ہے؟ منزل کیا ہے تیری؟

زندگی کے صحرا میں نہ کوئی راستہ اور نہ ہی کوئی سایہ۔ خوابوں کی تتلیاں، امید کا تانابانا، کل کا خوف، آج کی بے چینی!

انسان بہت سی بھول بھلیوں سے گزر رہا ہوتا ہے۔

میں اس وقت تعلیم الاسلام ہائی سکول کی آٹھویں جماعت میں تھا۔

اس زمانے میں ہر کلاس کے دو یا تین حصے ہوتے تھے۔ سیکشن اے، سیکشن بی، سیکشن سی وغیرہ۔

سیکشن اے میں لائق، سیکشن بی میں درمیانہ قابلیت اور سیکشن سی میں نالائق در نالائق۔

یہ فدوی سیکشن سی کے آخری بنچ کی زینت تھا۔ میرے حلقہ دوستاں میں ایسے لوگ تھے جن کو علم سے دُشمنی تھی اور بس یوں کہ جیسے غلیل اور چڑیا کا رشتہ۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میں ان غلیل باز دوستوں کے ساتھ رہا تو چڑیا تو کیا کوئی مچھر بھی نہیں مار سکوں گا۔

مجھے اس گوریلا گروپ سے نجات حاصل کرنا تھی۔

باالآخر ایک روز میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر مجھے فرار حاصل کرنا ہے۔ اور ایک اعلیٰ مستقبل کی تلاش میں نکلنا ہے تو ان احباب سے دوری اختیار کرنا ہو گی۔

راستے جدا، منزل الگ۔۔۔

زندگی دوراہے پر کھڑی تھی اور فیصلہ کا وقت آچکا تھا۔

نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن

صرف قابلیت ہی ایک معیار تھا جو مجھے ان دوستوں کی دلدل سے نکال سکتا تھا۔ اور سیکشن سی میں قابلیت کہاں؟؟

پھر ایک روز کیا ہوا؟ میں سیکشن اے میں چلا گیا۔

ایک چھوٹا سا لڑکا اور ایک استاد آمنے سامنے۔ کلاس خاموش اور استاد حیران!

تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ اپنی کلاس میں جاؤ۔

مجھے اس کلاس میں آنا ہے۔

تو ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس جاؤ اور اجازت لے کر آؤ۔

میں خاموش تھا۔

میں نہیں جاسکتا۔۔۔ میں نے اس کلاس میں آنا ہے۔

تو اپنی کلاس میں واپس جاؤ۔

میں چُپ چاپ وہاں سے چلا آیا۔۔۔ لیکن اپنی کلاس میں بھی واپس نہیں گیا۔ جہاں مسلسل میرے غیر حاضری لگتی رہی۔

دوسرا دن

تیسرا دن

میرا اصرار اور استاد کا انکار۔۔۔

وہی میرا سوال اور وہی ان کا جواب۔۔۔

بالآخر چوتھے روز استاد محترم نے نہ جانے کیا سوچ کر کہا کہ تم کلاس کے آخری بنچ پر جا کر بیٹھ جاؤ۔ لیکن اس سیکشن میں تمہارا داخلہ نہیں ہو گا۔

میں چُپ چاپ جا کر آخری بنچ پر بیٹھ گیا۔

ایک اچھوت کی طرح ساری کلاس مجھ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی تھی۔ میں اکیلا سارا دن کلاس سے الگ بیٹھا رہتا۔

میرے سیکشن میں میری غیر حاضری لگتی رہی۔

نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔

غالباً ایک ہفتہ بعد استاد محترم نے ایک اشارے سے مجھے بلایا۔

میرا دل ایک خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

اب کیا ہو گا؟ کیا ہو گا؟

کیا ہو گا کی بازگشت میرے ذہن میں ایک طوفان بپا کر رہی تھی۔ استاد محترم نے میرا نام رجسٹر میں لکھ لیا!!!

اس دن میرے خوابوں کو پر لگ گئے۔

استاد محترم ماسٹر اتالیق صاحب، خدا آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ میں ہمیشہ آپ کے لیے دعا گو رہوں گا۔

سُخن کا سفر

عبد الشکُور، کلیو لینڈ اوہائیو

اردو ادب میں جب بات خاص طور پر اردو شاعری کی ہو تو بات لامحالہ میر تقی میرؔ سے ہی شُروع ہو گی۔ یہ اٹھارویں صدی کا زمانہ ہے۔ اس وقت اردو شاعری اپنے ابتدائی تدریجی تخلیق کے نہایت اہم دور میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ اردو زبان بھی ابھی بننے سنورنے کے مراحل طے کر رہی تھی۔ تاہم سترھویں صدی کے آخر تک اردو زبان، فی ذاتہٖ، واضع طور پر اپنی ایک منفرد شکل اور ہیئت میں متشکّل ہو چکی تھی۔ اردو کا یہ — قبول صورت چہرہ، ہمیں ولیؔ دکنی کی شاعری میں صاف نظر آرہا ہے۔

ہماری آج کی اردو غزل کی بنیاد، زبان اور بیان کے عام فہم عصری لوازم کے ساتھ، سترھویں صدی میں، ولی محمد ولیؔ دکنی (۱۶۶۷۔۱۷۰۷) کے دور میں رکھی جا چکی تھی۔ اس طور، ولیؔ دکنی کو موجودہ غزل کا موجد بھی کہا گیا ہے یہ کہ میر تقی میرؔ نے بھی ولی دکنی کے کام کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

خُوگر نہیں کُچھ یُوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشُوق جو تھا اپنا، باشندہ دکن کا تھا

ہم نے آج کے اس سُخن کے سفر کو میر تقی میرؔ سے شُروع کرنے کی جو بات کی ہے، ہماری آج کی اردو شاعری کے حوالے سے اس کا وجود اور اہمیّت مُسلّم ہے اور ساتھ ہی ہم جو ولیؔ دکنی کا ذکر لائے ہیں، وُہ بھی اسی پیمانے سے اہم اور مُسلّم ہے۔ اس کے اثبات میں، ولیؔ دکنی کی ریختہ گوئی اور میر تقی میرؔ کی ریختہ گوئی کا اتصال بالاعتراف، ہمارے سامنے ہے۔ اس میں جو بُعدِ زمانی موجود ہے وہ بھی اپنی جگہ نہایت اہم ہے۔

اس اتّصال کا نُقطہء آغاز، ولی محمد ولیؔ دکنی کی دلّی کی طرف منزل آرائی سے ہم آہنگ ہے، جس کے نتیجے میں، جنُوب اور شمال میں، رسم و راہ کا در امکان وا ہونے لگا۔ روایت ہے کہ ولیؔ کا نام اور شاعری، ولیؔ سے پہلے ہی دلی پُہنچ چُکے تھے اور دلی کے گلیوں بازاروں میں، ولیؔ

دکنی کے اشعار گُنگنائے جانے لگے تھے۔ کیوں نہ ہوتا، یہ اشعار ہی ایسے تھے کہ گویا گُلوں پر شبنم افشانی ہو رہی ہو:

مَسند گُل منزل شبنم ہُوئی
دیکھ رُتبہ، دیدہء بیدار کا

دلّی گویا مسندِ گُل ہے اور ولیؔ اس پر، مثلِ نُزولِ شبنم، منزل آرا ہو رہے ہیں۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سخن کے اس سفر میں، ولیؔ دکنی کی دلی کی طرف یہ منزل آرائی میر تقی میرؔ (۱۷۲۳۔۱۸۱۰) سے کُچھ عشرے پہلے کی ہے اس وقت میرؔ تو موجود نہ تھے لیکن ولیؔ دکنی کا یہ شعر کسی خاص سَمت اشارہ کر رہا تھا

یہ ریختہ ولیؔ کا جاکر اُسے سُناوٴ
رکھتا ہے فکر روشن جو انوریؔ کے مانند

ولیؔ کے اس شعر کو پڑھ کر، اس کے رُوئے سُخن کی طرف بھی خیال جاتا ہے۔ اگر سترھویں اور اٹھارویں صدی کے سنگم پر اطراف نظر دوڑائیں تو ایسا معلُوم ہوتا ہے کہ ولیؔ کے اس شعر کا رُوئے سُخن گویا، خاص میر تقی میرؔ کی طرف ہی ہے کہ جب بعد کے زمانے میں میرؔ کا ظہُور ہو تو ولیؔ کا یہ ریختہ اسے تُحفتہً دیا جائے کہ وُہی اسکا اہل اور سزاوار ہو گا، روشن فکر رکھنے والا، انوریؔ کے مانند۔ اس طور اگر ولیؔ دکنی کو میر تقی میرؔ کے لیے 'ارہاص' کے مُشابہ کہیں تو کوئی عجب بات نہ ہو گی، حق تو یہ ہے کہ سُخن وری کی دُنیا بھی ایک طرح رُوحانی خواص اپنے اندر رکھتی ہے کہ قلب اور رُوح کی لطیف ہم آہنگی سے ہی سچّے سُخن کی تخلیق ظہُور میں آتی ہے۔

ولیؔ دکنی سے پہلے، اردو شاعری اور اردو غزل بہر حال موجود تھی اور مُختلف ادوار میں، وقت کے چلن کے ساتھ ساتھ ترقّی اور ارتقا کا عمل مُسلسل جاری رہا ہے، تاہم جسے ہم اردو شاعری اور اردو غزل کی کلاسیکی روایت کہتے ہیں، وُہ ولی محمّد ولیؔ دکنی سے ہی شُروع ہوتی ہے اور اس کے بعد سلسلہ آگے چلتا ہے۔

ولیؔ دکنی سے قبل کے ادوار کے لحاظ سے، سولھویں صدی میں اہم اور قابل ذکر ناموں میں گولکنڈہ کے سُلطان قُلی قُطب شاہ معانیؔ (۱۵۶۵۔۱۶۱۰) کا نام آتا ہے جس کے کلام اور دیوان کی دریافت اور تشہیر ہمارے زمانے کے حوالے سے بیسویں صدی کے اوائل میں مولوی عبدالحق (۱۸۷۲۔۱۹۶۱) اور ڈاکٹر مُحی الدین زورؔ قادری (۱۹۰۵۔۱۹۶۳) کے ذریعے ہُوئی۔ ڈاکٹر زورؔ نے دیوان مُرتّب کرتے ہُوئے بیشتر مقامات پر غیر مانُوس الفاظ کے نیچے مُستعمل اردو کے الفاظ لکھنے کی سعی کی ہے۔

پندرھویں صدی میں احمد آباد گجرات میں، شیخ بہاالدّین

باجنؔ (متوفی ۱۵۰۶) اور خاص دکّن میں فخر دین نظامی کی مثنوی پدم راؤ کدم راؤ کا حوالہ ہے جس کی تخلیق کا زمانہ ۱۴۳۱ اور ۱۴۳۴ کے درمیان بتایا جاتا ہے۔ اس سے پہلے، چودھویں صدی عیسوی میں گو اردو شاعری کے حوالے سے تاریخ میں کوئی قابل ذکر نام نظر نہیں آتا، تا ہم اُردو زبان کی تاریخ کے تناظر میں، سیّد مُحمّد حُسینی بندہ نواز گیسو دراز (۱۳۲۱۔۱۴۲۲) کے نام سے صرفِ نظر ممکن نہیں کیونکہ اردو ادب کے آغاز کے ضمن میں یہ نام نہایت مُحترم حیثیت کا حامل ہے۔

اب ابتدائی دور میں، تیرھویں صدی میں، ابُوالحسن معین الدّین خُسروؔ (۱۲۵۲۔۱۳۲۵) کشور ہند کی اس نوخیز کو، شاعری کے خُوبصورت رنگ اور آہنگ میں ڈھالتے اور سُر اور تال سے رُوشناس کراتے نظر آتے ہیں۔ اور یہ بات مُتفق علیہ ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی میں، اپنے مَولد لاہور میں، عربی اور فارسی کے مُقتدر شاعر خواجہ مسعُود سعد سلمان (۱۰۴۶۔۱۱۲۱) نے اردو زبان میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ سعد سلمان کے دیوان کی تصدیق امیر خُسروؔ نے بھی کی ہے۔ اسطرح تاریخی لحاظ سے یہی زبان اردو اور اردو شاعری کا نُقطۂ آغاز ہے۔ اور یُوں گیارھویں صدی میں مسعُود سعد سلمان سے چل کر اٹھارویں صدی میں میر تقی میرؔ تک اردو زبان اور اردو شاعری کا زمانے کے نشیب و فراز کو طے کرتے ہُوئے سات صدیُوں کا سفر ہے۔

ولیؔ دکنی کے بعد وہ اردو شاعری اور وہ اردو غزل جسے ہم میرؔ کے دور کی کلاسیکی شاعری اور میرؔ کے دور کی غزل کہتے ہیں اسے موجودہ معلُوم شکل میں آنے کے لیے گویا ایک صدی درکار تھی اور اس دوران یہ صُورت بھی نظر آتی ہے کہ میر تقی میرؔ (۱۷۲۳۔۱۸۱۰) کے ہمعصروں میں مرزا مُحمّد رفیع سوداؔ (۱۷۱۳۔۱۷۸۱) اور خواجہ میر دردؔ (۱۷۲۵۔۱۷۸۵) یُوں کہیں کہ آدھے رستے یا اس سے کچھ ہی زیادہ ساتھ رہے۔ اُدھر ولیؔ دکنی کے ہم وطن سراجؔ اورنگ آبادی (۱۷۱۳۔۱۷۶۳) اہلِ دل کو 'خبرِ تحیّرِ عشق' کے وجدان سے سرشار کرتے کُچھ اور ہی جلدی اپنا سفر پُورا کر گئے۔ دُوسری طرف ولی مُحمّد نظیرؔ اکبر آبادی (۱۷۳۵۔۱۸۳۰) نے نظم کا میدان سنبھال رکھا تھا اور ناسخؔ (۱۷۷۲۔۱۸۳۵) نے تو ابھی مکتبِ عشق میں گویا نیا نیا ہی قدم رکھا تھا۔ اس طور ہم دیکھتے ہیں کہ عُروسِ سُخن کے بنانے سنوارنے کا باقی سارا کام میر تقی میرؔ کو گویا تنِ تنہا ہی کرنا تھا۔ لیکن لگتا ہے یہ گُونا یکسُوئی رنگ لائی اور میرؔ ہی کے ہاتھوں 'عُروسِ سُخن' اک مرکز صد نگاہ مہ جبین کے مانند یُوں طُلوع ہوتی ہے:

ہم ہُوئے تُم ہُوئے کہ میرؔ ہُوئے
اُس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

میرؔ اپنی شاعری اور اس میں پڑھنے والوں کے لیے خاص کشش

کے بارے میں خُود ہی کہتے ہیں:

کیا جانُوں دل کو کھینچیں ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کُچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

سُخن کے اس سفر میں اگلا سنگِ میل اسد اللہ خان غالبؔ (۱۷۹۷۔۱۸۶۹) ہے۔ اگر غالبؔ کے ہاں مضامین اسلُوب اور آہنگ کو دیکھتے ہیں تو ایک لمحے کو محسُوس ہوتا ہے جیسے غالبؔ اس سے قبل کے جاری تدریجی تخلیق کے دور کے عوامل سے ماورا ہوا اور یہ کہ غالبؔ کے مضامین، اسلُوب اور آہنگ فقط غالبؔ ہی سے مُختص ہیں۔ اس عمومی تاثر کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ غالبؔ میرؔ کا مدّاح بھی ہے اور میرؔ کے مقام کا برملا مُعترف بھی ہے یُوں کہ،

ریختے کے تُمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

اور یہ کہ،

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو مُعتقدِ میرؔ نہیں

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، غالبؔ کی شعر گوئی کا آغاز قریباً دس سال کی سِن میں، میر تقی میرؔ کی زندگی میں ہی ہو چُکا تھا۔ اس پہلُو سے دیکھیں تو میر تقی میرؔ اور غالبؔ کے زمانہ میں ایک طبعی تسلسل کی صوُرت نظر آتی ہے۔ یُوں معلُوم ہوتا ہے کہ، اُنیسویں صدی کے عشرہء اوّل میں پُہنچ کر میر تقی میرؔ نے گویا شمع اسد اللہ خان غالبؔ کے سامنے رکھ دی ہو اور بلا شُبہ میرؔ کے بعد غالبؔ نے جن عظمتوں کو چھُوا ہے، اس نے غالبؔ کو زندہ جاوید بنا دیا ہے اور پھر غالبؔ نے جو یہ کہا ہے،

سب کہاں کُچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صُورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یہاں جو لالہ و گُل میں نمایاں ہو جانے والی صُورتوں کا ذکر مستُور ہے ان میں، اردو سُخنوری اور اردو شاعری کے حوالے سے اور کئی صُورتوں کے ساتھ، غالبؔ اور میرؔ کی صُورتیں فنا سے گُریز پائی کے نُمائندہ مظہر کے طور پر نظر آتی ہیں۔ ایسے مظاہر کا ایک اور آفاقی پہلُو بھی ہے جس کا دائرہ بہت وسیع ہے، لیکن یہاں اس کے ذکر کا محل نہیں۔ تاہم کوئی کمال یا کمالِ فن خواہ کسی بھی مثبت حوالے سے ہو بہر حال ایک انعام ہی قرار پائے گا۔ یہ عمل جاری و ساری ہے، دونوں مادی اور رُوحانی دُنیاؤں میں۔ فنا سے گُریز پائی کی بات جو غالبؔ نے کی ہے قریب کے زمانے میں آ کر احمد ندیمؔ قاسمی (۱۹۱۴۔۲۰۰۶) بھی کہتے نظر آ رہے ہیں، ایک مُختلف رنگ میں،

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہُوں، سمندر میں اُتر جاؤں گا

یہاں ایک ضروری وضاحت کی صُورت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ جو ہم غالبؔ کے بعد، بظاہر ایک لمبی جست لگا کر، احمد ندیمؔ قاسمی تک آ گئے ہیں تو یہ ہم نے عمداً اور بقائمی حوش و حواس کیا ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ ہم اٹھارہویں صدی اور ما قبل سے شُروع ہونے والے اس سفر کو اکیسویں صدی کے رُبع اوّل تک مُناسب طور پر پُورا کر سکیں کہ چند مرحلے ابھی بیچ میں اور بھی ہیں جو طے کرنے ہیں۔ اور دُوسری وجہ، کُلیۃً نظریاتی ہے۔ ہم نے جو اردو شاعری کے ابتدائی تدریجی تخلیق کے دور کی بات میرؔ سے شُروع کی وہ غالبؔ تک تکمیل کو پُہنچ چکی اور یہاں غالبؔ اس جادہ سُخن میں ایک سنگِ میل کی صُورت ظاہر ہُوا ہے جہاں سے جادہ سُخن کی اگلی منزل کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سنگِ میل کے بعد کے زمانہ کو 'غالبؔ کا دور' قرار دینے میں دو آراء نہیں ہو سکتیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ غالبؔ سے شُروع ہونے والے اس دور میں، غالبؔ کو نکال کر شعر و سُخن کی بات کرنا کُچھ جچتا نہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ

’ اگر مُعتقدِ میرؔ ہونا اردو شاعری کا جُزوِ ایمان ٹھہرے تو غالبؔ سے بیعت ہونا، اردو شاعری پر تجدیدِ ایمان کیلیے ضروری معلُوم ہوتا ہے ‘ اسے آپ ہمارا، کُلیۃً ذاتی اور ذوقی خیال کہہ سکتے ہیں۔ اب ہم احمد ندیمؔ قاسمی کی بات کی طرف آتے ہیں اور اُن کا وہ شعر دُہراتے ہیں:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہُوں، سمندر میں اُتر جاؤں گا

یہ جو دریا کا سمندر میں اُتر جانے تک کا سفر ہے، دراصل بارش کے اس قطرے سے شُروع ہوتا ہے، جس کے لیے غالبؔ نے کہا ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا

یہاں فنا کا استعارہ، محدود سے لامَحدود کی سَمت ایک جَست کے معنٰی میں وارد ہُوا ہے اور یہی احمد ندیمؔ قاسمی کے اس شعر اور غالب کے اس مصرع کی رُوح ہے۔ تاہم یہ حقیقت خاطر نظر رہے کہ قطرے کا سفر بس یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ اسکی مُسافت کی منزلیں، قطرے کے گُہر ہونے تک پھیلی ہُوئی ہیں، جسکے بیچ میں دریا، سمندر، بادل، باراں اور پھر صدف تک رسائی کے مراحل آتے ہیں اور یہ آخری مرحلہ، جو گوہر کی تخلیق کا مرحلہ ہے ہر قطرے کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ، یُوئتیہِ مَن ایّشا کے تناظر میں، انسان کو دعوتِ فِکر بھی دیتا ہے۔

جہاں، غالبؔ کے ذکر کے ساتھ، احمد ندیمؔ قاسمی کا ذکر آیا ہے تو پروینؔ شاکر کے ذکر کو اس کے ’ عمُو ‘ کے ذکر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پروینؔ شاکر (۱۹۵۲۔۱۹۹۴) ہمارے دور میں، جس طور، لالہ و گُل کی خُوشبُو کے رنگ میں ظاہر ہُوئی اسی طرح اس کی پذیرائی خُوشبُو کی طرح ہُوئی اور یُوں پروینؔ شاکر کی پہلی کتاب کا نام بھی ’ خُوشبُو ‘ ہُوا اور یہ خوشبُو کُوبکُو پھیلتی گئی۔ اور پھر اچانک ایک دن پروینؔ شاکر نے یہ انکشاف کیا کہ،

باب اک اور محبّت کا کُھلا چاہتا ہے

اور پھر، کچھ ہی دن بعد، محبّت کا یہ باب کُھلا اور پروینؔ شاکر، اس باب میں، اس دروازے میں، بڑی سُرعت سے داخل ہو گئی، ایک نئی اور ’ ابدی خُوشبُو ‘ سے ہمکنار ہونے، اک حرفِ تازہ کی طرح۔ پروینؔ شاکر نے اپنی ہمعصر اور اس سے پہلے کی خواتین شاعرات کی نسبت، اپنے محسُوسات اور تجربات کو جس بے ساختگی اور سچّائی کے ساتھ، بے دھڑک کہہ دیا ہے، یہ اس کا ہی حوصلہ اور اس کا ہی ظرف ہے جس نے اسے مُنفرد اور ممتاز کر دیا، اس پر ہمارا ادنیٰ ساخراجِ عقیدت اسطرح ہے:

تمہارا حوصلہ ہر بات ان کہی کہہ دی
ہمارا ظرف کہ چُپ کو شعار کرتے ہیں

جب ہم پروینؔ شاکر سے پُوچھتے ہیں کہ تم نے یہ سب کچھ کیسے کہہ

اس داستان کے کرداروں میں، میجر محمّد اسحاق، محمّد حسین عطاؔ، کیپٹن ظفر اللہ پوشنی بھی شامل ہیں۔ یہاں یہ کہنا عجب نہ ہو گا کہ، اگر زنداں میں فیضؔ کے ساتھ میجر محمّد اسحاق، محمّد حسین عطاؔ اور ظفر اللہ پوشنی بھی زندانی نہ ہوتے تو پھر شاید، دیا، کیسے بیان کر دیا، تو ہمیں پہلے تو اس میں ایک گہرے کرب کی کیفیّت نظر آتی ہے اور اس کے بعد ایک عجیب سی، گُونہ آسودگی کا تاثّر ملتا ہے جسے وہ 'عطائے رب' کا نام دے کر کرب کی اس کیفیّت سے ایسے باہر آجاتی ہے جیسے کچھ ہُوا ہی نہ ہو اور اس کے لبوں پر یہ نغمہ تیر جاتا ہے،

جتنا ہو فزوں عطائے رب ہے
تخلیق کا کرب بھی عجب ہے

اور یہ تخلیق کا موضُوع بھی عجب ہے۔ اس کی کئی جہتیں ہیں۔ فیض احمد فیضؔ (۱۹۱۱۔ ۱۹۸۴ؔ)، جب ماسکو گئے ہیں، لینن امن انعام کے سلسلے میں، تو انہوں نے جو تقریر وہاں کی، وہ اردو میں تھی۔ اس تقریر کا پہلا جُملہ اسطرح ہے، ' الفاظ کی تخلیق و ترتیب، شاعر اور ادیب کا پیشہ ہے '

انسان کوئی پیشہ اس وقت اختیار کرتا ہے یا کر سکتا ہے جب اسے اس پیشے میں، کم سے کم حد تک مہارت حاصل ہو جائے، پھر پیشے میں یہ مہارت، تدریجاً بڑھتی چلی جاتی ہے، برعایتِ استعداد اور ریاضت۔ فیضؔ نے جس وقت یہ بات کہی، اس وقت وُہ جس مقام پر فائز تھے وہاں تک پُہنچنے میں نہ جانے کتنی بار خونِ دل میں اُنگلیاں ڈبوئی ہونگی اور کیسے کیسے کرب اور کرب انگیز حالات سے گُزرے ہونگے، اور پھر ان تجربات کو، کیسے رقم کر سکے ہونگے۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ ایک الف لیلوی سی داستان۔

'دستِ صبا' اور 'زنداں نامہ' اس موجودہ شکل میں ہمارے سامنے نہ ہوتے۔ نجاتِ دیدہ و دل کی تمنّا لیے یہ مُسافر، یُوں لگتا ہے 'تشنہء وصالِ منزل' ہی رہا کہ وہ خُود اپنے سفر کو اس بات پر ختم کرتے نظر آتا ہے،

ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

تاہم فیضؔ نے جادہء سُخن میں قدم قدم پر چراغ روشن چھوڑے ہیں کہ بعد میں آنے والے اس منزلِ نارسیدہ کا سفر جاری رکھ سکیں۔

اب کُچھ تبدیلی کی خاطر، لاہور کے اس کافی ہاؤس میں چلتے ہیں جو کسی زمانے میں 'زندہ دل لاہور' کے ادیبوں اور شاعروں کا میٹنگ پوائنٹ ہُوا کرتا تھا۔ کسی سے ملنا ہو یا دیکھنا ہو تو بس کافی ہاؤس پُہنچ جائیں۔ انڈیا ٹی ہاؤس بعدہُ، پاک ٹی ہاؤس۔ حکماء نے اسے شاعروں اور ادیبوں کا ٹھکانا کہا ہے۔ یہ بظاہر معمُولی سی جگہ اردو ادب اور شعر و سُخن کا گویا کھیت کھلیان تھا۔

پچھلے برس بھی بوئی تھیں لفظوں کی کھیتیاں
اب کے برس بھی اس کے سوا کچھ نہیں کیا
غُربت بھی اپنے پاس ہے اور بُھوک ننگ بھی
کیسے کہیں کہ اس نے عطا کچھ نہیں کیا

راوی بیان کرتے ہیں کہ جب، اقبال ساجد یہ دلدوز اشعار پڑھ رہے تھے تو اس وقت موجود ادیبوں اور شعرا کا جو حال تھا سو تھا آس پاس کی میزوں پر بیٹھے لوگوں کی حالت بھی دیدنی تھی۔ ہر چشم پُر نم ہر آنکھ آبدیدہ۔ اب یہ مقام تو ہماری ادبی تاریخ کا حصّہ بن چُکا۔ یہ ایک دور تھا جو کم و بیش، ساٹھ سالوں کے زندگی سے بھرپور، شب و روز اپنے اندر سمیٹے ہُوئے، بالآخر نوّے کی دہائی کے آخر میں ختم ہو گیا۔ کچن کے برتن بجھ گئے اور کافی ہاؤس کا صدر دروازہ بند ہو گیا۔ چند سال پہلے اس کافی ہاؤس کے دوبارہ کھولنے کی جو بات چلی، تو شاید اس لیے بھی کہ شہر میں ابھی انتظار حسین موجود تھے۔ یا میر تقی میرؔ کی اصطلاح میں ابھی رہے ہُوئے تھے۔ لیکن تیرہ چودہ سال بعد 2013 میں اِنتظار حُسین یہاں بیٹھ کر صرف انتظار ہی کر سکتے تھے۔۔۔ لیکن کس کا؟ اس صُورت میں 'یار گئے یادیں باقی' والی بات ہی باقی رہ جاتی ہے اور پھر انتظار حسین (1923-2016) یہاں بیٹھ کر یادوں میں کچھ ایسے کھوئے کہ خود بھی ان یادوں کا حصہ بن گئے۔ اور ان ہی یادوں میں شامل ایک یاد ناگاہ ہمیں ساٹھ پینسٹھ سال پیچھے لے جاتی ہے۔

کافی ہاؤس کے انتہائی جنُوب مغربی گوشے میں ایک شخص بیٹھا ہے۔ دُنیا و مافیہا سے بے خبر۔ روشنی کے لیے اس نے اپنی ہی وضع کا ایک چراغ جلا رکھا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے ہاتھ میں کوئی قلم بھی نہیں اور اس کے دونوں ہاتھ کافی ہاؤس کی میز پر اسطرح رکھّے ہیں جیسے کوئی نماز کے لیے ہاتھ باندھے ہو۔ اس کے سامنے ایک کتاب کھُلی رکھی ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس کتاب کے صفحات جیسے خالی خالی سے ہوں۔ ایک نوٹ بک کے خالی اوراق کی طرح۔ اور پھر یُوں ہوتا ہے کہ لحہ بہ لحہ اس کتاب میں کُچھ حروف اور الفاظ ظاہر ہوتے نظر آنے لگتے ہیں۔ اگر غور اور کمال توجہ سے مشاہدہ کریں تو ان اُبھرتے ہُوئے حروف و الفاظ میں ایک ہلکا سا ارتعاش محسُوس ہوتا ہے۔ جب دو سطریں پُوری ہو چکتی ہیں تو ان دو سطروں کے حروف اور الفاظ یکبارگی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ یہ اس کتاب کا پہلا ہی ورق ہے جس پر یہ الفاظ اپنے ہونے کا گویا بالجہر اعلان کرتے نظر آتے ہیں

لفظوں میں بولتا ہے رگِ عصر کا لہو
لکھتا ہے دستِ غیب کوئی اس کتاب میں

اور جس چراغ کا ذکر اُوپر آیا ہے رگِ عصر کی کشید سے ہی روشنی پاتا ہو گا۔ ایسی ماورائی سی کیفیّت اس ایک شخص سے مخصُوص ہے جس کا نام ناصرؔ کاظمی ہے۔۔۔ سیّد ناصر رضا کاظمی (۱۹۳۵-۱۹۷۲)،

آج پھر وُسعتِ صحرائے جُنوں
پُرسشِ آبلہ پا چاہتی ہے

کانٹوں کی زباں سُوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیِٔ پُرخار میں آوے

غالبؔ سے چل کر ناصرؔ کاظمی تک ایک طویل سفر ہے۔ آبلہ پا کے حوالے سے اگر دیکھیں تو اُدھر 'کانٹوں کی چُبھن' کا احساس نمایاں ہے اور ادھر 'پُرسشِ آبلہ پا' کی ادا۔۔۔ سُبحان اللہ!!

حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا۔ یہ آبلہ پا، یہ ناصرؔ کاظمی،

نئے دنوں کا سُراغ لے کر، کدھر سے آیا، کدھر گیا وُہ
ستارۂ شام بن کے آیا، برنگِ خوابِ سحر گیا وُہ

ناصرؔ کاظمی سے معذرت کیساتھ، کہ ان دو مصرعوں کی یہ ترتیب ہی، حسبِ حال معنیٰ اُجاگر کر رہی ہے۔ اگر ناصرؔ کاظمی موجُود ہوتے تو ہم اُنہیں اسطرف ضرور توجّہ دلاتے۔

پھر لاہور شہر کے انتہائی جنوب اور مغرب میں ایک شہر کہ اہلِ دل و نظر نے ایک زمانے میں اس کا نام 'روشنیوں کا شہر' رکھا تھا۔۔۔ ہمارا شہر کراچی۔ اس مقام پر فیضؔ کی بات یا فیضؔ کی یاد پھر در آئی ہے۔

صاحب دل و نظر، فیض احمد فیضؔ نے، لاہور شہر کو اپنی ایک یادگار نظم میں 'اے روشنیوں کے شہر' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ یہ نظم بوجوہ حُزنیہ ہے۔ طربیہ نہیں۔ اسیری کے زمانے کی ہے۔ دو شہر اور روشنیوں کے استعارے کے دو رنگ۔ تو یہاں شہر کراچی میں ہماری ملاقات ایک بظاہر مجہول سے شخص سے ہوتی ہے۔ انوکھی وضع کی عینک لگائے ہوئے۔ سفید کُرتے پاجامے اور سیاہ صدری میں ملبُوس۔ سر کے بال منتشر۔ ایک عجیب ہی حالت میں جس کے بارے میں وہ خود ہی کہہ اٹھتا ہے،

کوئی حالت نہیں یہ حالت ہے
کتنی آشوب ناک صورت ہے
انجمن میں یہ میری خاموشی
بُردباری نہیں ہے وحشت ہے

یہ جون ایلیا ہیں۔ ان کی ذات کی طرح، ان کا یہ مرکب نام بھی خاصا معنی نگر ہے۔ اور سچ پوچھئے تو ہمیں ان کے اس نام 'جون ایلیا' میں، عیسیٰ ابنِ مریم کی صداقت کا ثبوت مضمر نظر آتا ہے اور اس ایک صداقت میں کئی اور صداقتیں بھی!!! یہ شخص۔ جون ایلیا۔ ہمیں اس لیے بھی اچھا لگتا ہے کہ اس نے، عبید اللہ علیمؔ کو ٹُوٹ کے چاہا ہے۔ اس سے محبُت کی ہے۔ علیمؔ جب آنکھیں موندھے، دم سادھے، اپنے ابدی سفر اور دائمی مستقر کی طرف قدم بڑھانے کو تھا تو دفعتاً جون ایلیا اس کے پاس آن کھڑا ہوتا ہے اور علیمؔ کو مخاطب کر کے کہتا ہے، 'او شیطان مکر نہ کر۔ اُٹھ اور میرے گلے لگ جا'۔

جنوری ۱۹۷۴ میں جب عبید اللہ علیمؔ (۱۹۳۹۔۱۹۹۸) کی، پہلی کتاب 'چاند چہرہ ستارہ آنکھیں، آئی تو جون ایلیا نے لکھا، 'علیمؔ شاعر ہی نہیں بلکہ شاعر کے اندر کا وہ شیطان بھی ہے جسے شعور کی سب سے بدنام اور سرگرم سچائی کا استعارہ کہا جائے'۔ یہ وہ عبید اللہ علیمؔ ہے جس کا نغمہ آج بھی اسی طرح سنائی دے رہا ہے جیسا ہمارے بیچ ہوتے ہوئے سنائی دیتا تھا اور اس کی دعا کو کیسی قبولیّت نصیب ہوئی۔

مرے خدا مجھے وہ تابِ نے نوائی دے
میں چپ رہوں بھی تو نغمہ مرا سنائی دے

اور یہ وہی شاعر ہے، جو اپنے لوگوں اپنے ہمعصروں اور لحہ لحہ تاریکی میں ڈوبتے ہوئے شہروں کو جاتے ہوئے یہ دُعا دے گیا،

اُتار ان میں کوئی اپنی روشنی یارب
کہ لوگ تھک گئے ظلمت سے اب بہلتے ہوئے

اللہ کرے یہ دعا بھی کبھی قبول ہو جائے۔ آمین۔

یہ چاند چہرہ ستارہ آنکھوں والا وہ شاعر ہے جس نے اپنا رشتہ جب براہ راست میرؔ سے ہونے کا انکشاف یہ کہتے ہوئے کیا کہ

پہلا شاعر میرؔ ہوا اور اس کے بعد ہوں میں
پہلے وہ تصویر ہوا اور اس کے بعد ہوں میں

تو سننے والے، ششدر رہ گئے اور کچھ انگُشت بدنداں۔

ہم نے بات میرؔ سے شروع کی اور چلتے چلتے میرؔ کی بات میرؔ ہی کے ایک محب اور مدّاح تک آ گئی۔ اگر میرؔ اس دنیا میں کچھ دن کیلیے مستعار آتے اور علیمؔ کی اس وارفتگی کو اور محبُت کو دیکھتے تو، پُکار اُٹھتے،

اے چاہنے والے مُجھے اس عہد میں
میرا بُہت آداب ہو، تُم کون ہو

اور یُوں سُخن کا سفر جاری ہے، منزل بہ منزل، عہد بہ عہد!!

باتیں حضرت قاضی محمد اسلم صاحب کی

چوہدری نصیر احمد۔ کینیڈا

دوست احباب اپنے بزرگوں، والدین اور دیگر اقارب کی زندگیوں کے بارہ میں مضمون شائع کرواتے رہتے ہیں۔ جب بھی کبھی ایسا مضمون نظر سے گذرتا ہے تو میری نظر حضرت پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ مدت سے یہ خواہش دبی رہی اور بوجہ مصروفیات زندگی اس کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ چند روز سے پھر اس خواہش نے شدت پکڑی ہے اور اس خیال سے بھی کہ حضرت قاضی صاحب کا وجود ایسا نافع الناس تھا کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں احباب کسی نہ کسی رنگ میں ان سے مستفید ہوئے۔ ایک لمبا عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور جیسے مشہور تعلیمی ادارے سے منسلک رہے اور پرنسپل کا عہدہ پایا۔ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے صدر بھی رہے۔ حکومت کے اعلیٰ تعلیمی عہدے بھی حاصل کئے اور آخیر میں کچھ عرصہ کے لیے تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے پرنسپل بھی رہے۔ جلسہ سالانہ ربوہ کے اجلاسوں کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ان تمام ادوار میں مکرم قاضی صاحب کے وجود سے ہزاروں طلباء (جن میں سے سینکڑوں احباب آج کل اہم سرکاری اور غیر سرکاری افسران کا درجہ پاتے ہوں گے) فیض یافتہ ہوئے۔ ویسے تو ان کا پسندیدہ مضمون فلسفہ و نفسیات تھا لیکن شخصیت ایسی جامع تھی کہ ہر مضمون سے تعلق رکھنے والا طالبعلم ان کے وجود سے نفع حاصل کر سکتا تھا۔

ایسے نفع بخش وجود کے بارہ میں کچھ لکھنا بعض ایسی باتیں محفوظ کرنے کا موجب ہوگا جو ان کی شخصیت کے بعض لطیف پہلو اُجاگر کرتی ہیں اور اس سے بڑھ کر ہم تاریخ میں یہ بھی محفوظ کر سکیں گے کہ کیسے کیسے مایہ ناز سپوت احمدیت کی خدمت کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس طریقہ سے ہم ایک طرح کا شکریہ ادا کر سکیں ان خدمات اور فوائد کے بدلہ میں جو ہم نے ان کی زندگیوں سے حاصل کئے۔

تعلیمی اداروں کو شہرت، فخر اور وجہ ٔامتیاز بعض وجوہ کی بنیاد پر ہوتا ہے مثلاً فلاں ادارہ اتنی مدت سے خدمت کے فرائض انجام دے رہا ہے یا کون سی مشہور شخصیت اس ادارہ سے منسلک رہی ہے۔ یا پھر اس کی عمارت اتنی قدیم یا جدید ہے مثلاً پاکستان میں پنجاب یونیورسٹی کو اپنے تعلیمی معیار میں اپنی قدیمی روایات سے خواہ کسی قدر دوری ہی کیوں نہ ہو لیکن ایشیا کی یہ ایک مشہور درسگاہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے چل رہی ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا حال کتنا ہی پتلا کیوں نہ ہو لیکن اس کے قیام کی تاریخ اپنی مخصوص وجہ ٔامتیاز رکھتی ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ ملنا ایک وقت میں قابلیت کا ایک معیار تصور ہوتا تھا۔

گورنمنٹ تعلیم الاسلام کالج ربوہ اپنی شہرت، فخر اور وجہ ٔامتیاز اس بات سے حاصل کرتا ہے کہ اس کے قیام میں اور چلانے میں ایسی بے لوث اور خدا رسیدہ ہستیاں کارفرما ہیں جن کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کی قابلیت اور عظمت کی پیش گوئیاں کیں اور اپنے وعدوں کو خوب نبھایا۔ اپنے قیام سے لے کر ایک لمبے عرصہ تک یہ ادارہ حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کی سرپرستی میں رہا۔ آپ کے امام جماعت احمدیہ کے انتخاب کے بعد یہ اہم ذمہ داری حضرت قاضی محمد اسلم صاحب کی خدمات سلسلہ احمدیہ میں اضافہ کا موجب بنی۔ آپ کی شخصیت کسی مخصوص تعارف کی محتاج نہیں۔ ہزاروں لوگ جن کا جماعت احمدیہ سے تعلق بھی نہیں آپ سے متعارف ہی نہیں بلکہ معترف ہیں۔ تعلیم الاسلام کالج ربوہ کا حکومت کی تحویل میں جانے سے قبل طوطی بولتا تھا۔ یہ اہم ادارہ نہ صرف جماعت احمدیہ کے طلباء کی تعلیم و تربیت پر کمربستہ تھا بلکہ غیر از جماعت طلباء کثرت کی تعداد میں اس میں داخلہ لیتے۔ کالج کے اس معیار کو پیدا کرنا اور اس شہرت کو حاصل کرنا دین دار اور بے لوث خدمت گار اساتذہ کی قربانیوں کا نتیجہ تھا۔ ان واقفین اساتذہ کی قابلیتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے واسطے یہ ضروری تھا کہ اس ادارہ کی سربراہی ایسے اشخاص کے پاس ہو جو اپنے تجربہ اور علم میں اپنی مثال آپ ہوں۔ اس لیے حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کی نظر جماعت احمدیہ کے امام منتخب ہونے کے بعد اس ادارہ کی سرپرستی کے واسطے حضرت قاضی محمد اسلم صاحب پر پڑی۔ آپ اپنے تجربہ، علم اور شخصیت کے لحاظ سے اپنی واحد مثال تھے۔

۱۹۶۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب میں نے تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لیا تو حضرت قاضی صاحب ایک حادثہ کے باعث ٹانگ کے ٹوٹنے کی وجہ سے لاہور میں صاحبِ فراش تھے۔ نئے طالب علموں کو اپنے نئے ماحول اور ادارہ کو سمجھنے اور واقفیت پیدا کرنے کے واسطے اک خاص جستجو ہوتی ہے، اس لیے دیگر طلباء سے اپنے اساتذہ کے بارہ میں سوالات کرنا ایک جزوِ لازم کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی زمرہ میں پرنسپل کی شخصیت بھی زیر بحث آتی ہے۔ نتیجتاً نئے طلباء جلد ہی کالج کی اہم شخصیتوں کے بارہ میں ایک رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اس تگ و دَو کے نتیجہ میں حضرت قاضی صاحب کی شخصیت کا جو تصور میرے ذہن میں اُبھرا اس نے خواہشِ ملاقات میں شدت پیدا کر دی۔

میرا قیام فضلِ عمر ہوسٹل میں تھا جس کے انچارج چوہدری محمد علی صاحب تھے۔ آپ تھے تو فلسفہ کے پروفیسر لیکن رعب انگریزی زبان کی وجہ سے تھا۔ چوہدری صاحب طلباء کی اس کمزوری کو خوب جانتے تھے۔ اسی وجہ سے انتظامی معاملات کو سلجھانے میں انگریزی زبان اکثر استعمال کرتے۔ اس بات کا تو علم نہیں کہ انگریزی

زبان انصاف کے تقاضے کس حد تک پورا کرتی لیکن وقتی طور پر امن و امان قائم کرنے کا یہ ایک موثر طریق تھا۔ شاید انگریز قوم بھی ہندوستان پر اسی ہنر کی فوقیت کی بناء پر دو سو سال حکومت کر گئی۔ انگریز کے انصاف کے قصے تو بہت مشہور ہیں۔ بعض اوقات خیال آتا ہے کہ شاید ان کا معاملہ بھی کچھ مختلف نہ ہو۔ بہر حال چوہدری صاحب نے فضل عمر ہوسٹل کے معاملات میں انگریزوں کی تاریخ سے ضرور فائدہ حاصل کیا۔

حضرت قاضی صاحب کے صحت یاب ہوتے اور واپس کالج آنے تک ہم ایک سال کا عرصہ کالج اور ہوسٹل میں گذار چکے تھے۔

اپنے پرنسپل کو دیکھنے اور ملنے کا شوق تو پہلے سے ہی موجوں پر تھا۔ ہوسٹل میں رہنے والے طلباء کو ایک مزید فائدہ یہ ہوا کہ حضرت قاضی صاحب مغرب کی باجماعت نماز ادا کرنے کی غرض سے روزانہ ہوسٹل تشریف لاتے اور آدھ گھنٹہ ' گھنٹہ طلباء کی غیر رسمی محفل میں مختلف باتیں کرتے۔ اس طرح ''استاد شاگرد'' کے مخصوص رشتہ اور ماحول سے علیحدہ ایک گھریلو سماں پیدا ہوتا۔ ایسے معلوم ہوتا جیسے قاضی صاحب بھی ہماری طرح ہوسٹل میں رہتے ہیں اور وہ دوری جو پرنسپل کا عہدہ اپنے ساتھ لاتی ہے دور ہو جاتی۔

قاضی صاحب کچھ اپنی طبیعت کے لحاظ سے اور کچھ عمر کے تقاضہ کے پیشِ نظر دھیمی آواز سے گفتگو کرتے۔ اس لیے میری خواہش رہتی کہ ان کے قریب بیٹھنے کی جگہ ملے۔ ٹانگ ٹوٹنے کے باعث ضعف اور کمزوری بھی باقی تھی۔ اس لیے مغرب کی نماز کے بعد چند طلباء پرنسپل کی کوٹھی تک ان کے ساتھ چلتے۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اور دھیمے لہجہ میں فلسفیانہ باتیں کرتا ہوا یہ مختصر سا قافلہ کوئی پندرہ منٹ میں پرنسپل کی کوٹھی تک پہنچتا (ویسے یہ فاصلہ کوئی تین منٹ کا ہو گا) جب کبھی ٹانگ پر بوجھ محسوس ہوتا ' قاضی صاحب کسی ساتھی طالبعلم کے کندھے کا کچھ دیر کے لیے سہارا لے لیتے۔ ایک عجیب سماں ہوتا۔ کالج کا پرنسپل اپنے طلباء کے ساتھ یوں گھل مل جاتا جیسے وہ اس ادارہ کا سربراہ نہیں بلکہ ہزاروں طلباء میں سے ایک طالبعلم ہے۔ قاضی صاحب کی شخصیت کا یہ ایک نہایت ہی سادہ اور لطیف پہلو تھا۔

قاضی صاحب کا بعد نماز مغرب کا یہ مختصر سا قافلہ اکثر اوقات سینئر طلباء پر مشتمل ہوتا اور ہر چند میری خواہش ہوتی لیکن موقع نہ ملتا۔ ایک دن بعد نماز نوٹس بورڈ کے قریب کھڑا تھا کہ اچانک قاضی صاحب ایک طرف سے اکیلے ہی نمودار ہوئے اور میرے ساتھ گفتگو شروع کر دی اور پھر فرمانے لگے کہ چلو گھر کی طرف چلتے ہیں۔ مجھے وہاں تک چھوڑ آؤ۔ میں ساتھ ہو لیا۔ جیسے انتظار ہی کر رہا تھا کہ آج تو موقع ملے گا۔ راستہ میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اچانک ایک جگہ رُک گئے اور فرمانے لگے کہ ایک سوال پوچھتا ہوں۔ جواب دیانتداری سے دینا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو یوں گویا ہوئے۔ ''دیکھو میرا دماغ ٹھیک ہے'' اس اچانک سوال پر مجھے حیرانگی ہوئی کہ کالج کا پرنسپل جو اپنی ذات میں مانی ہوئی شخصیت ہے مجھ سے کیسا سوال کر رہا ہے۔ میں نے کہا'' قاضی صاحب یہ آپ کیا سوال پوچھ رہے ہیں۔'' تو فرمانے لگے ''بوڑھا ہو گیا ہوں کبھی کبھار بھول بھی جاتا ہوں اور کبھی یہ بھی خیال آتا ہے معلوم نہیں دماغ بھی ٹھیک رہا ہے کہ نہیں اس لیے سوچا کہ پوچھ ہی لیتا ہوں۔ بھلا میری کیا حیثیت تھی کہ اسی شخصیت کے دماغ کے بارہ میں اپنی رائے دیتا۔ ہم تو ان دماغوں سے کچھ سیکھنے گئے تھے نہ کہ ان پر

اپنی رائے کا اظہار کرنے اور پھر خرابی دماغ کا جو تصور اس وقت میرے ذہن میں تھا اس کے مطابق اس امتحان میں صرف وہی لوگ پاس ہو سکتے تھے جو بازاروں میں اور گلیوں میں منہ سے مغلظات نکالتے رہیں۔ قاضی صاحب اس حالت سے کوسوں دور تھے اس لیے ہر چند اس امتحان میں پاس نہ ہوئے۔ ایک لمبے عرصہ تک یہ واقعہ مرے ذہن میں نقش رہا کہ بالآخر قاضی صاحب نے مجھ سے ایسا سوال کیوں کیا جبکہ نہ میں ان کے قریبی احباب میں تھا اور نہ اپنی عمر اور تجربہ اور علم کی بناء پر ایسے سوال کا جواب دے سکتا تھا۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ جب ان سے رفاقت بڑھی اور ان کی طبیعت اور مزاج کو قریب سے دیکھنے کا مواقع ملا تو یہ حقیقت کھلی کہ حضرت قاضی صاحب مدرس ہونے کے علاوہ پیشہ ورانہ فلسفی بھی تھے۔ اس واقعہ کے بعد قاضی صاحب کے قافلہ میں میری شمولیت اسان ہو گئی اور اکثر اوقات ان کی رفاقت کا موقع ملتا رہا۔ ایک دن کہنے لگے تم روزانہ میرے ساتھ گھر تک چلا کرو۔ یوں ایک سولہ سالہ طالب علم کا کالج کے ساٹھ پینسٹھ برس کے پرنسپل کے ساتھ دوستی کا آغاز ہوا' جو برسوں قائم رہا۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ مجھے ایک دفعہ اپنی نظر چیک کروانے لاہور جانا پڑا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس غرض کے لیے ڈاکٹر بشیر احمد صاحب اور ڈاکٹر سجاد احمد صاحب کی کلینک چلا گیا۔ مجھے اس بات کا قطعاً علم نہ تھا کہ ڈاکٹر بشیر احمد صاحب قاضی محمد اسلم صاحب کے بھائی ہیں۔ جب واپس آیا تو ہوسٹل کے کھانے کے کمرہ کے قریب قاضی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد میں نے ذکر کیا کہ گذشتہ ہفتہ لاہور جانے کا اتفاق ہوا اور وجہ سفر بھی بیان کی۔ پوچھنے لگے کون سے ڈاکٹر کے پاس گئے تو جواب دیا کہ ڈاکٹر بشیر صاحب کی کلینک میں سجاد احمد نامی ڈاکٹر تھے۔ یہ سن کر قدرے توقف کے بعد فرمایا۔ "میرے تمام بھائی پڑھ لکھ کر بڑے کام کے آدمی بن گئے۔ نکما صرف میں ہی رہا۔ میں نے دریافت کیا کہ ڈاکٹر بشیر صاحب آپ کے بھائی ہیں تو فرمانے لگے ہاں بلکہ ہمارے خاندان میں اکثر کا پیشہ ڈاکٹری ہی ہے۔ اس کے بعد کچھ سرسری تعارف اپنے خاندان کا کروایا۔ حضرت قاضی صاحب کا اپنے بارہ میں یہ بیان صریحاً کسرِ نفسی پر مبنی تھا۔ گو خود ڈاکٹر نہ بنے لیکن کتنے ڈاکٹر ان کے معتقد ہوئے اور اس زمانہ میں جب آپ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے کتنے طلباء میڈیکل کالجوں میں گئے اور ڈاکٹر بن کے نکلے۔ کون حساب رکھ سکتا ہے۔

میرے تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے زمانہ میں قاضی صاحب کے پرنسپل ہونے کا دور بہت تھوڑا تھا۔ جلد ہی کمزوری صحت کی بناء پر ریٹائرمنٹ پر لاہور چلے گئے لیکن اس مختصر عرصہ میں اپنا نقش چھوڑ گئے۔ اکثر ان کے دفتر میں بلا جھجک چلا جایا کرتا اور خود بھی فرمایا کرتے کہ جب کام ہو آجایا کرو۔ اگر دفتر نہ ہوں تو گھر آجایا کرو۔ کئی بار تو صرف محفل کی خاطر ان کی کوٹھی پر عصر کی نماز کے بعد چلا جایا کرتا اور چائے پر محفل جمتی۔

کچھ عرصہ بعد جب میں نے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو قاضی صاحب سے تعلقات دوبارہ بحال ہو گئے۔ یہ زمانہ ۷۶-۱۹۷۳ء کا ہے۔ اس عرصہ کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک دور مئی ۱۹۷۴ء سے پہلے کا ہے اور ایک بعد کا۔ ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ ۱۹۷۴ء مئی کے بعد بہت کم احمدی طلباء پنجاب یونیورسٹی میں رہ گئے۔ جو رہے وہ بھی تکلیف دہ ماحول میں تھے۔ کھانے کے برتن الگ کر دیئے گئے۔ دھمکیاں ہر وقت آتی

رہتیں۔ سامان وغیرہ جو تھا وہ تو پہلے ہی سب کچھ ہنگاموں کی نظر ہو چکا تھا۔ کبھی کبھار اِکاّ دُکاّ چیز کسی کے کمرہ میں نظر آتی تو لوٹ مار کے چند ماہ یاد آ جاتے۔ اس دور سے تمام احمدی واقف ہیں بلکہ پاکستان کی تاریخ گواہ ہے۔

۱۹۷۴ء مئی سے پہلے کا دَور ایک ایسا زمانہ تھا جس میں احمدیہ انٹر کالجیٹ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن ایک بہت فعال اور بے دھڑک تنظیم تھی اور ہوتی بھی کیوں نہ جبکہ اس کی سرپرستی ہمارے موجودہ امام حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خود کرتے تھے۔ بنفسِ نفیس کئی اجلاسوں میں شرکت کرتے اور جب بھی لاہور آتے آنے کی اطلاع پہلے بھجوا دیتے تاکہ ملاقات کا ایک موقع نکل سکے۔ اسی دور میں مجھے بھی ایک سال اس ایسوسی ایشن کا جنرل سیکرٹری ہونے کا موقع ملا۔ اس دوران متعدد مذاکرے مختلف موضوعات پر جلسے بڑی شان سے پورے لاہور میں کئے۔ تعلیمی اداروں میں پوسٹر وغیرہ لگائے جاتے۔ باقاعدہ دعوتی کارڈ پر موضوع جلسہ' تقریر کرنے والے علماء اور پروفیسر صاحبان کے نام گرامی درج ہوتے اور یہ کارڈ بکثرت طالب علموں میں تقسیم کئے جاتے۔ دعوت عام دی جاتی۔ اکثر ایسے جلسے YMCA ہال مال روڈ لاہور پر منعقد ہوتے اور نیو کیمپس سے پنجاب یونیورسٹی کے طلباء کے لیے علیحدہ بسوں کا انتظام ہوتا۔ حضرت قاضی صاحب کی ساری زندگی طلباء میں گذری' اس لیے ان تمام سرگرمیوں میں آپ کا وجود حاضر ہوتا۔ گاہے بگاہے جب بھی کوئی مشکل امر پیش آتا حضرت قاضی صاحب بڑی دلچسپی سے ہماری مدد کرتے۔ ان کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ ان کے ساتھ بات کرنے میں نہ تامل ہوتا اور نہ ہچکچاہٹ محسوس ہوتی۔ اس قدر سادہ طبیعت اور مذاق تھا کہ عمر کا فرق ذرہ بھی حائل نہ ہوتا۔ اس لیے ایک بات ہمیشہ طے ہوتی کہ جلسہ کی صدارت قاضی صاحب کے ذمہ رہتی۔ آپ نہ صرف صدارت فرماتے بلکہ تمام تقاریر کو بہت غور سے سنتے اور نوٹس لیتے رہتے۔ ایسے ہی ایک جلسہ کا انتظام کیا۔ حسبِ معمول صدارت قاضی صاحب کے ذمہ رہی اور مقام بھی YMCA ہال مال روڈ تھا۔

مقررین میں حضرت سیدنا مرزا طاہر احمد صاحب اور حضرت مولانا عبدالمالک صاحب شامل تھے اور ''سوشلزم' کے موضوع پر تقریر کے لیے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ انتظامات کے پروفیسر اے آر جعفری A. R. JAFERY صاحب تھے۔ چونکہ یہ موضوع ایسا تھا کہ حکومتِ وقت اور اس کے سربراہ خود کو اس موضوع کا ماہر تصور کرے اور اپنے خیال اور رائے کو حرفِ آخر کا درجہ دیتے۔ اس لیے طلباء میں گہری دلچسپی تھی۔ ہال سارا بھرا ہوا تھا بلکہ باہر بھی احباب کھڑے تھے۔ نہایت عمدہ تقریریں ہوئیں۔ پروفیسر جعفری صاحب ایک ہر دلعزیز شخصیت ہیں۔ بڑی پرزور تقریر کی۔ حضرت قاضی صاحب صدارت کے فرائض کے ساتھ ساتھ نوٹس لیتے رہے اور جونہی پروفیسر صاحب نے ختم کیا حضرت قاضی صاحب نے ایک کاغذ کا ٹکڑا مجھے دیا کہ جعفری صاحب کو دے دو۔ جعفری صاحب پڑھ کر بہت محظوظ ہوئے اور صرف اتنا کہا کہ مجھے آپ سے اتفاق ہے گو جعفری صاحب کی تقریر سوشلزم پر تھی اور قاضی صاحب کے ریمارکس مذہبی تھے۔

ایک دفعہ میرے ایک کلاس فیلو جو بہاری تھے اور مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے بعد سے کچھ خانگی اور مالی پریشانیوں کا شکار رہتے۔ والدین بنگلہ دیش میں پھنسے ہوئے تھے اور ذریعہ آمد نہ تھا۔ یہ صاحب ایک دفعہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مالی طور پر بہت تنگی ہے اور کام کی تلاش کر رہا ہوں لیکن بے سود۔ نیشنل بنک

میں درخواست دی ہوئی ہے اور جگہ بھی خالی ہے لیکن وہاں ایک احمدی افسر ہے اگر تم سفارش کرو تو شاید کام بن جائے۔ میں تو ان احمدی افسر صاحب سے واقف نہ تھا لیکن اچانک حضرت قاضی صاحب کا خیال آیا۔ فوراً ہی ہم دونوں موٹر سائیکل پر حضرت قاضی صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ حال احوال دریافت کرنے پر پوچھا کہ کہو کس طرح آئے ہو۔ میرے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر فوراً سمجھ گئے ہوں گے کہ کسی کام کی غرض سے آیا ہے۔ میں نے مدعا بیان کیا اور اپنے دوست کے تعارف میں یہ بھی بیان کر دیا کہ یہ دوست ہماری جماعت سے تعلق نہیں رکھتے۔ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے کہ یہ تم نے کیسی بات کی۔ ضرورت مند کی حاجت پوری کرنے میں احمدی اور غیر از جماعت کا فرق بے معنی ہے۔ ہماری جماعت کا ایک بڑا مقصد حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے خدمتِ خلق بھی بیان کیا ہے اور اس میں مذہب اور فرقہ کی قید نہیں۔ پھر ذرا سختی سے فرمانے لگے۔ ”دیکھو اب کبھی ایسی بات نہ کرنا“ میں نے ذرا وضاحتاً کہا کہ قاضی صاحب میں نے تو صرف تعارف میں ایسا کہا ہے۔ میرا مدعا فرقہ پرستی نہیں۔ تو فرمانے لگے کہ حاجت کے وقت ایسے فرق کو ظاہر کرنا ایسا تاثر دیتا ہے جیسے ہم فرقہ پرستی کرتے ہیں۔ پھر میرے دوست کی طرف متوجہ ہوئے اور اس احمدی افسر کا نام پتہ پوچھا۔ سن کر کہنے لگے کہ میں تو ایسے احمدی نامی آدمی کو نہیں جانتا پھر کچھ اور کوائف پوچھے جن کا جواب ہمارے پاس نہ تھا پھر فرمایا کہ لاؤ پنسل کاغذ۔ جب حاضر کیا تو اس افسر کے نام سادہ سی چٹھی لکھ دی۔ میں نے کہا کہ قاضی صاحب آپ تو اس کو جانتے بھی نہیں اور چٹھی کیسے لکھ دی تو فرمانے لگے اگر احمدی ہے اور میں نہیں جانتا تو وہ مجھے جانتا ہی ہو گا اور اگر گورنمنٹ کالج لاہور کا پڑھا ہو گا تو کچھ لحاظ تو کرے گا۔ پھر فرمایا ہمارے پاس سے کوئی آدمی خالی تو نہ جائے۔ اپنا فرض تو پورا کر دیا۔ یہ تھی حضرت قاضی محمد اسلم صاحب کی شخصیت۔

۱۹۷۳ء کے جلسہ سالانہ کے موقع پر میرے ساتھ تین غیر از جماعت دوست تھے۔ پنجاب یونیورسٹی میں ہم اکٹھے پڑھتے تھے۔ وہ تینوں آج کل موجودہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ ایک تو ترقی کر کے ڈی سی کے عہدے تک پہنچ گئے ہیں۔ ہم میں آپس میں بحث چھڑ گئی کہ آیا پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کا عہدہ بڑا ہے یا پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا۔ گورنمنٹ کالج چونکہ ایک مشہور درسگاہ ہے اور ایک زمانہ میں داخلہ ملنا قابلیت کا ایک معیار تصور ہوتا تھا۔ اس لیے اس کالج کے پڑھے ہوئے طلباء اکثر قدرے فخر سے یہ بات بیان کرتے ہیں کہ ہم اس کالج کے طلباء ہیں اور یہ احساس برتری بعض اوقات غیر ضروری طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ میرے دوست بھی غالباً اسی مرض کے پنجہ میں گرفتار تھے اور مصر تھے کہ پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور اپنے عہدہ میں بہ اعتبار معاشرتی مقام زیادہ اہم ہے اور بات اور بڑھا دی کہ اگر پرنسپل کو وائس چانسلر بننے کی پیشکش کی جائے تو انکار کر دے گا۔ میری رائے اس کے اُلٹ تھی اور دلیل یہ تھی کہ گورنمنٹ کالج لاہور اپنی تاریخ میں کتنی شہرت ہی کیوں نہ رکھتا ہو بہر حال پنجاب یونیورسٹی کے ماتحت آتا ہے اور اپنی ڈگریاں بھی پنجاب یونیورسٹی کے نام سے لیتا ہے اس لیے یہ دونوں برابر نہیں۔ کالج یونیورسٹی کا کئی لحاظ سے ضمنی ادارہ ہے اور نسبتاً جغرافیائی حدود میں مقید ہے۔ لیکن ہمارے دوست نمک حلالی کے طور پر یہ بات ماننے کو تیار نہ تھے۔ اب یہ بحث اپنے نتیجہ میں بے مقصد تھی لیکن ختم ہونے کو نہ آتی۔ اچانک میری نظر حضرت قاضی صاحب پر پڑی جو اس وقت جلسہ سالانہ کی صدارت کر رہے تھے

۔میں نے کہا کہ اس جلسہ کے بعد اس بحث کا خاتمہ کروادوں گا۔ فرمانے لگے وہ کیسے۔ میں نے عرض کیا کہ جلسہ کی صدارت جو صاحب کررہے ہیں وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ اب اس سے زیادہ موزوں منصف نہ مل سکے گا۔ جب کہ وہ خود بھی اسی مقام پر رہے ہیں جس کی تم تعریف کررہے ہو۔ جلسہ کے اختتام پر ہم سب قاضی صاحب کے انتظار میں کھڑے ہوگئے۔ جم غفیر کے جانے کے بعد ہلکی گرد میں سے حضرت قاضی صاحب اکیلے ہی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میرے دوست یہ بات ماننے پر تیار نہ ہوئے۔ یہ وہی شخص ہیں جو آدھ گھنٹہ پہلے اتنے بڑے جلسہ کی صدارت فرما رہے تھے اور اب اکیلے پیدل ہی چلے آتے ہیں۔ پہلے تو یہ مسئلہ حل کیا اور قاضی صاحب سے یہ سوالات پوچھے کہ کیا آپ ہی صدارت فرمارہے تھے اور پھر کہ کیا آپ ہی گورنمنٹ کالج کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ جب جواب اثبات میں ملا تو حیرانگی اور بڑھی۔ اس پر میں نے اپنے دوست کو بتایا کہ جماعت احمدیہ شخصیت پرستی نہیں کرتی اور احمدیت نے کئی لحاظ سے چھوٹوں کو بڑا اور بڑوں کو چھوٹا کر کے ایک ایسا معیار قائم کر دیا ہے جس میں فرق زیادہ نہیں۔ ان باتوں کے بعد میں نے قاضی صاحب سے عرض کیا کہ ایک مسئلہ زیر بحث ہے جس کو صرف آپ ہی سلجھا سکتے ہیں۔ جب قصہ بیان کیا تو آپ کی گورنمنٹ کالج کی وابستگی کی یاد دوبارہ اچانک ہری ہوگئی۔ فرمانے لگے کہ ''بھئی گورنمنٹ کالج کی تو بات ہی اور ہے۔'' اس پر میرے دوست بہت خوش ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ سوال یہ بھی ہے کہ آیا گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کو وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کا عہدہ پیش کیا جائے تو کیا وہ قبول کرے گا۔ کچھ توقف کے بعد فرمایا کہ ''وقت وقت کی بات ہے۔ آج کل تو کسی جگہ عزت نہیں۔'' پھر کہا۔

''بھئی سچی بات ہے اگر میرے وقت میں مجھے ایسی پیش کش کی جاتی تو میں تو قبول کر ہی لیتا۔ لیکن ایسا موقع ہی نہ آیا۔'' اس جواب سے میری تسلی بھی کروادی۔ پھر فرمانے لگے کہ کیا پروگرام ہے۔ میں نے عرض کیا کہ کوئی خاص نہیں۔ تو کہنے لگے چلو پھر میرے ساتھ گھر تک وہاں چل کر باتیں کرتے ہیں۔ قاضی صاحب چونکہ چوہدری محمد علی صاحب کی کوٹھی پر ٹھہرے تھے اس لیے وہاں چلے گئے۔ راستہ میں چلتے ہوئے چوہدری صاحب بھی سائیکل پر جاتے ہوئے ہم سے آن ملے۔ پھر یہ قافلہ آہستہ آہستہ قاضی صاحب کی رفتار پر چوہدری صاحب کی کوٹھی پہنچا اور دھیمی روشنیوں میں اور دو فلاسفروں کی محفل میں دیر تک باتیں ہوتیں رہیں۔ کبھی قادیان کے زمانہ کی کبھی تقسیم ہند کے دور کی، کبھی تعلیم الاسلام کالج کے قیام کی اور کبھی فلسفہ اور نفسیات کی۔

آج قاضی صاحب ہم میں نہیں۔ ان کی یادیں باقی ہیں۔ ہزاروں زندگیوں پر ان کی ذات نے اثر ڈالا۔ اگر ہم سب طالب علم اپنی اپنی یادداشت سے چند واقعات اکٹھے کر سکیں تو حضرت قاضی صاحب کی زندگی، شخصیت اور خدماتِ دینی اور دنیاوی پر ایک مربوط کتاب بن جائے اور یہ ایک عمدہ شکرانہ کا موجب ہوگا ان کی خدمات کے بدلہ میں جو انہوں نے اپنی ساری زندگی میں بطور مدرس کیں۔

الفضل ربوہ۔ 31 جنوری، یکم فروری 1990ء

مجید امجد کی شاعری

ایک تھا مجید امجد

انتخاب: جمیل الرحمان۔یو۔کے

مجید امجد کی شاعرانہ عظمت کی پہچان عام طور پر ان کی نظموں سے قائم کی جاتی ہے۔ لیکن ان کی شاعری کا دوسرا رخ اُن کی غزلیں بھی ہیں۔ جن سے ایک عام قاری ناواقف ہے۔۔ اُن کی نظموں کی طرح اُن کی غزلیں بھی حیات و کائنات کی حقیقت کو کھوجنے، وقت کے جبر میں انسانی اختیار کی حد بندی کا مشاہدہ کرنے اور اس دلکش کائنات میں محبت کے جوہر کی فراوانی مگر اس تک انسانوں کی نارسائی کے تذکرے سے لبریز ہیں۔ انسان مرکز کائنات ہونے کے باوجود چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے کیوں محروم ہے اور اسے اپنی رائیگانی کا ملال ہمہ وقت کیوں مضطرب رکھتا ہے۔ اس کے واضح اشارے مجید امجد کی غزل میں بھی موجود ہیں۔ ایک سب سے بڑی خصوصیت انتہائی گہری اداسی کے ساتھ شاعر کا محزون مگر جرات مندانہ لہجہ بھی ہے۔ اور اس محزونی کے ساتھ اس ہمت و جرات کے مظاہرے میں توازن بھی مجید کی غزلوں کا اختصاص ہے۔۔ ایک تھا مجید امجد۔۔ کے عنوان سے

صرف ان کی غزلوں سے انتخاب پیش کیا جارہا ہے۔

دلوں کی آنچ سے تھا برف کی سلوں پہ کبھی
سیاہ سانسوں میں لتھڑا ہوا پسینہ بھی

وہ ایک ٹیس جسے تیرا نام یاد رہا
کبھی کبھی تو مرے دل کا ساتھ چھوڑ گئی
رکا رکا ترے لب پر عجب سخن تھا کوئی
تری نگہ بھی جسے ناتمام چھوڑ گئی
فراز دل سے اترتی ہوئی ندی امجدؔ
جہاں جہاں تھا حسیں وادیوں کا موڑ، گئی

یہ دو ساتھی نہ جانے کب بچھڑ جائیں
مری عمر رواں ہے اور میں ہوں

شاید پلٹ کے آ نہ سکے اب بہار
گا، پژمردہ شاخسار پہ جھک کر ستار چھیڑ

اس نیلی دھند میں کتنے بجھتے زمانے راکھ بکھیر گئے
اک پل کی پلک پر دنیا ہے، کیا جینا ہے کیا مرنا ہے

ہر حال میں اک شوریدگی افسون تمنا باقی ہے
خوابوں کے بھنور میں بہہ کر بھی خوابوں کے گھاٹ اترنا ہے

اس گلی سے پلٹ کے کون آئے
ہاں مگر اس گلی میں جانا تو ہو

نہ شاخ گل پہ نشیمن نہ راز گل کی خبر
وہ کیا رہا جو جہاں میں قلندرانہ رہا

مری ہی عمر تھی جو میں نے رائگاں سمجھی
کسی کے پاس نہ تھا ایک سانس وافر بھی
خود اپنے غیب میں بن باس بھی ملا مجھ کو
میں اس جہان کے ہر سانحے میں حاضر بھی
یہ کس کے اذن سے ہیں اور یہ کیا زمانے ہیں
جو زندگی میں مرے ساتھ ہیں مسافر بھی

کاغذ کے پانیوں سے جو ابھرے تو دور تک
پتھر کی ایک لہر پہ تختے تھے ناؤ کے
کیا رو تھی جو نشیب افق سے مری طرف
تیری، پلٹ پلٹ کے ندی کے بہاؤ سے

ہر وقت فکر مرگ غریبانہ چاہیے
صحت کا ایک پہلو مریضانہ چاہیے
اب درد شش بھی سانس کی کوشش میں ہے شریک
اب کیا ہو اب تو نیند کو آ جانا چاہیے

بنے یہ زہر ہی وجہِ شفا جو تُو چاہے
خریدلوں میں یہ نقلی دوا جو تُو چاہے
تجھے تو علم ہے کیوں میں نے اس طرح چاہا
جو تُو نے یوں نہیں چاہا تو کیا جو تُو چاہے
ذرا شکوہ دو عالم کے گنبدوں میں لرز
پھر اس کے بعد ترا فیصلہ جو تُو چاہے

پھر تو سب ہمدرد بہت افسوس کے ساتھ یہ کہتے تھے
خود ہی لڑے بھنور سے کیوں؟ زحمت کی ہم جو بیٹھے تھے
ماتھے جب سجدوں سے اٹھے تو صفوں صفوں جو فرشتے تھے
سب اس شہر کے تھے اور ہم ان سب کے جاننے والے تھے
جن کی جیبھ کے کنڈل میں تھا نیش عقرب کا پیوند
لکھا ہے ان بدسخنوں کی قوم پہ اژدر برسے تھے

گلی کوئی بے نام، مکاں میں بے نمبر
ہے آباد مرا گھر کنعاں، کنعاں
دنیا --- اک دائم آباد محلہ
اس اینٹوں کے ابد میں سائے انساں

پکارتی رہی بنسی بھٹک گئے ریوڑ
نئے گیاہ نئے چشمہء رواں کے لیے
سحر کو نکلا ہوں مینہ میں اکیلا کس کے لیے؟
درخت، ابر، ہوا، بوئے مہرباں کے لیے
ضمیر خاک میں خفتہ ہے میرا دل امجد
کہ نیند مجھ کو ملی خواب رفتگاں کے لیے

پلٹ پڑا ہوں شعاعوں کے چیتھڑے اوڑھے
نشیبِ زینہء ایام پر عصا رکھتا
کسی خیال میں ہوں یا کسی خلا میں ہوں
کہاں ہوں، کوئی جہاں تو مرا پتہ رکھتا

اس اک باڑ کے اندر سب کچھ اپنا ہے
باہر دنیا، کس کو پروا دنیا کی
اجلی کینچلیوں میں صاف تھرکتی ہے
ساری کوڑھ کلنکی مایا دنیا کی
دنیا کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کا کام
پہروں بیٹھے باتیں کرنا دنیا کی

والہانہ رابطوں میں جبر کے پہلو بھی دیکھ
جو بھی دل ہے ایک پنجرا ہے ترے دل کے لیے
تُو کہ اپنے ساتھ ہے اپنے بدن کے واسطے
کوئی تیرے ساتھ تنہا ہے ترے دل کے لیے

دھیان میں روز جگمگاتا ہے قہقہوں سے لدا ہوا تانگا
دو طرف بنگلے ریشمی نیندیں اور سڑک پر فقیر اک ناٹگا

جو دن کبھی نہیں بیتا وہ دن کب آئے گا
انہی دنوں میں اس اک دن کو کون دیکھے گا

اس اپنی مٹی میں جو کچھ امٹ ہے مٹی ہے
جو دن ان آنکھوں نے دیکھا ہے کون دیکھے گا
میں روز ادھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے
میں جب ادھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا

عمروں کے اس معمورے میں ہے کوئی ایسا دن بھی جو
روح میں ابھرے چاند کے سورج کے سیال سمندر کو
یہ انجانا شہر، پرائے لوگ، اے دل! تم یہاں کہاں
آج اس بھیڑ میں اتنے دنوں کے بعد ملے ہو، کیسے ہو

ان آئینوں میں جلے ہیں ہزار عکس عدم
دوام درد ترے رت جگے نہیں گزرے
سپردگی میں بھی اک رمز خود نگہ داری
وہ میرے دل سے مرے واسطے نہیں گزرے
بکھرتی لہروں کے ساتھ ان دنوں کے تنکے بھی تھے
جو دل میں بہتے ہوئے رک گئے نہیں گزرے

کیا سفر تھا بے صدا صدیوں کے پل کے اس طرف اس موڑ تک
پے بہ پے ابھرا سنہری گرد سے اک نالہ دل دلگیر دل
وار دنیا نے کیے مجھ پر تو امجد میں نے اس گھمسان میں
کس طرح جی ہار کر رکھ دی نیام حرف میں شمشیر دل

اپنے دل کی چٹان سے پوچھو ریزہ اک پنکھڑی کا کتنا بوجھل ہے
اک آنسو کی بوند میں دیکھو دنیا دنیا عالم عالم جل تھل ہے

روح سے روح کا نازک بندھن پھولوں کی زنجیر میں جکڑی زندگیاں
کتنے دکھ ہیں کتنا چین ہے کیسی دھوپ ہے کتنا گہرا بادل ہے
آنکھ کی پتلی سانس کی ڈوری دل کی تھاپ اک پل کی نرت کا تماشا ہے
گلتی کھوپڑیوں سے چنی دیواروں پر اک جلتی جوت کی جھل جھل ہے

کیا روپ دوستی کا کیا رنگ دشمنی کا
کوئی نہیں جہاں میں کوئی نہیں کسی کا
اس التفات پر ہوں لاکھ التفات قرباں
مجھ سے کبھی نہ پھیرا رخ تُو نے بے رخی کا

جنون عشق کی رسمِ عجیب کیا کہنا
میں اُن سے دور وہ میرے قریب کیا کہنا
جو تم ہو برقِ نشیمن تو میں نشیمنِ برق
الجھ پڑے ہیں ہمارے نصیب کیا کہنا
لرز گئی تری لو میرے ڈگمگانے سے
چراغِ گوشہء کوئے حبیب کیا کہنا

عزم نظر نہیں ہوس جستجو نہیں
کوئی بھی اب شریک غم آرزو نہیں
میرے نصیبِ شوق میں لکھا تھا یہ مقام
ہر سُو ترے خیال کی دنیا ہے تُو نہیں

ترے فرقِ ناز پہ تاج ہے مرے دوشِ غم پہ گلیم ہے
تری داستاں بھی عظیم ہے مری داستاں بھی عظیم ہے

تہِ خاک کرمکِ دانہ جو بھی شریک رقصِ حیات ہے
نہ بس ایک جلوہءِ طور ہے نہ بس ایک شوقِ کلیم ہے
حرم اور دیر فسانہ ہے یہی جلتی سانس زمانہ ہے
یہی گوشہ ءدل ِناصبور ہی کنجِ باغِ نعیم ہے

وہ کوئی کنجِ سمن پوش تھا کہ تودہء خس
اک آشیانہ بہر حال آشیانہ رہا
تم اک جزیرہءدل میں سمٹ کے بیٹھ رہے
مری نگاہ میں طوفانِ صد زمانہ رہا

کوئی دوزخ کوئی ٹھکانہ تو ہو
کوئی غم حاصلِ زمانہ تو ہو
گونجتے گھومتے جہانوں میں
کوئی آواز محرمانہ تو ہو
ان اندھیروں میں روشنی کے لیے
طاقِ چوبیں پہ شمع خانہ تو ہو
اس گلی سے پلٹ کے کون آئے
ہاں مگر اس گلی میں جانا تو ہو
میں سمجھتا ہوں ان سہاروں کو
پھر بھی جینے کا اک بہانہ تو ہو

اس اپنی کرن کو آتی ہوئی صبحوں کے حوالے کرنا ہے
کانٹوں سے الجھ کر جینا ہے پھولوں سے لپٹ کر مرنا ہے
رستوں پہ اندھیرے پھیل گئے اک منزل غم تک شام ہوئی
اے ہم سفر و کیا فیصلہ ہے اب چلنا ہے یا ٹھہرنا ہے
ہر حال میں اک شوریدگیء افسونِ تمنا باقی ہے
خوابوں کے بھنور میں بہہ کر بھی خوابوں کے گھاٹ اترنا ہے

دل نے اک ایک دکھ سہا، تنہا
انجمن انجمن رہا، تنہا
ڈھلتے سایوں میں تیرے کوچے سے
کوئی گزرا ہے بارہا ، تنہا
تیری آہٹ قدم قدم اور میں
اس معیت میں بھی رہا تنہا
کہنہ یادوں کے برف زاروں سے
ایک آنسو بہا ، بہا تنہا
گونجتا رہ گیا خلاؤں میں
وقت کا ایک قہقہہ ، تنہا

کیا سوچتے ہو اب پھولوں کی رُت بیت گئی ،رت بیت گئی
وہ رات گئی وہ بات گئی ، وہ ریت گئی رُت بیت گئی
اک لہر اٹھی اور ڈوب گئے ہونٹوں کے کنول آنکھوں کے دیے
اک گونجتی آندھی وقت کی بازی جیت گئی ، رت بیت گئی
تم آگئے میری بانہوں میں کونین کی پینگیں جھول گئیں تم بھول گئے
جینے کی جگت سے ریت گئی ، رت بیت گئی
اک دھیان کے پاؤں ڈول گئے اک سوچ نے بڑھ کر تھام لیا
اک اس ہنسی، اک یاد سنا کر گیت گئی ، رت بیت گئی
یہ لالہ و گل کیا پوچھتے ہو سب لطفِ نظر کا قصہ ہے

رُت بیت گئی جب دل سے کسی کی پیت گئی، رت بیت گئی

افق افق پہ زمانوں کی دھند سے ابھرے
طیور، نغمے، ندی، تتلیاں گلاب کے پھول
کس انہماک سے بیٹھی کشید کرتی ہے
عروسِ گل پہ قبائے جہاں، گلاب کے پھول
یہ میرا دامنِ صد چاک یہ ردائے بہار
یہاں شراب کے چھینٹے وہاں گلاب کے پھول
مری نگاہ میں دورِ زماں کی ہر کروٹ
لہو کی لہر، دلوں کا دھواں، گلاب کے پھول
سلگتے جاتے ہیں چپ چاپ ہنستے جاتے ہیں
مثالِ چہرۂ پیغمبراں گلاب کے پھول

دل سے ہر گزری بات گزری ہے
کس قیامت کی رات گزری ہے
ہائے وہ لوگ خوبصورت لوگ
جن کی دھن میں حیات گزری ہے
تمتماتا ہے چہرۂ ایام
دل پہ کیا واردات گزری ہے

کس کو بتائیں اب جو یہ الجھن آن پڑی ہے
جب تک تم کو بھول نہ پائیں ، یاد نہ آئیں
اکثر اکثر دوری سمٹی رستے پھیلے
منزل تیرا قربِ گریزاں ، کیا بتلائیں

قیامت کہاں کی، جزا کیا سزا کیا ہے
ہر سانس اک تازہ محشر سنبھل جا
نہیں اس خرابات میں اذنِ لغزش
یہ دنیا ہے اے قلبِ مضطر سنبھل جا

کیا گریباں چاک صبح اور کیا پریشاں زلفِ شام
وقت کی لامنتہی زنجیر کی کڑیاں تمام
دیکھیے تنکے کی ناؤ کب کنارے جا لگے
موج ہے دہشت خروش اور سیل ہے وحشت خرام
زیست کی صہبا کی رو تھمتی نہیں تھمتی نہیں
ٹوٹتے رہتے ہیں نشے پھوٹتے رہتے ہیں جام

آ سازِ گلستاں کو بہ مضراب خار چھیڑ
مطرب کوئی ترانہ بیادِ بہار چھیڑ
کل یہ جگہ تھی وادیٔ نکہت رباب اٹھا
کل یاں ہجومِ گل تھا سرودِ بہار چھیڑ
قصہ کوئی بہ ماتمِ جام و سبو سنا
نغمہ کوئی بہ تعزیتِ سبزہ زار چھیڑ

اس انجمن میں دیکھیے اہلِ وفا کے ظرف
کوئی ادا شناس ہے کوئی ادا شکار
ظلِ ہما کی اوٹ میں چلے پہ تیر رکھ
آساں نہیں نگاہ کے نخچیر کا شکار

کیا خبر کس موڑ پر مہجوریادیں آ ملیں
گھومتی راہوں پہ گردِ آرزو میں گھومیے
کنج دوراں کو نئے اک زاویے سے دیکھیے
جن خلاؤں میں نرالے چاند گھومیں، گھومیے

نظامِ کہنہ کے سائے میں عافیت سے نہ بیٹھ
نظامِ کہنہ تو گرتی ہوئی عمارت ہے
وطن چمکتے ہوئے پتھروں کا نام نہیں
یہ تیرے جسم تری روح سے عبارت ہے

اے کنجِ عافیت تجھے پاکر پتہ چلا
کیا ہمہمے تھے گردِ سرِ رہگزار کے
میں ایک پل کے رنجِ فراواں میں کھو گیا
مرجھا گئے زمانے مرے انتظار کے

امیدِ دیدِ دوست کی دنیا بسا کے ہم
بیٹھے ہیں مہر و ماہ کی شمعیں بجھا کے ہم
کس کو خبر کہ ڈوبتے لمحوں سے کس طرح
ابھرے ہیں یادِ یار تری چوٹ کھا کے ہم

ہائے وہ ایک شام کہ جب مست نے بلب میں
جگنوؤں کے دیس میں تنہا روانہ تھا
یہ کون ادھر سے گزرا، میں سمجھا حضور تھے
اک موڑ اور مڑ کے جو دیکھا زمانہ تھا
اک چہرہ اس پہ لاکھ سخن تاب رنگتیں
اے جراتِ نگہ تری قسمت میں کیا نہ تھا

یہ بدلیوں کا شور یہ گھنگھور قربتیں
بارش میں بھیگتے یہ دو رہگیر کون ہیں
امجد دیارِ لعل و گہر میں کسے خبر
وہ جن کی خاکِ پا بھی ہے اکسیر، کون ہیں

جب اک چراغِ راہگزر کی کرن پڑے
ہونٹوں کی لو لطیف حجابوں سے چھن پڑے
شاخِ ابد سے جھڑتے زمانوں کا روپ ہیں
یہ لوگ جن کے رخ پہ گمانِ چمن پڑے
تنہا گلی، ترے مرے قدموں کی چاپ، رات
ہر سُو وہ خامشی کہ نہ تابِ سخن پڑے
یہ کس حسیں دیار کی ٹھنڈی ہوا چلی
ہر موجۂ خیال پر صدہا شکن پڑے
اک پل بھی کوئے دل میں نہ ٹھہرا وہ رہ نورد
اب جس کے نقشِ پا ہیں چمن در چمن پڑے
صحرائے زندگی میں جدھر بھی قدم اٹھیں
رستے میں ایک آرزوؤں کا چمن پڑے

امجد طریقِ مے میں ہے یہ احتیاط شرط
اک داغ بھی کہیں نہ سرِ پیرہن پڑے

کرنوں کے طوفان سے بجرے بھر بھر کر
روشنیاں اس گھاٹ پر ڈھو گئے کیا کیا لوگ
سانجھ سمے اس کنج میں زندگیوں کی اوٹ
بج گئی کیا کیا بانسری رو گئے کیا کیا لوگ
میلی چادر تان کر اس چوکھٹ کے دوار
صدیوں کے کہرام میں سو گئے کیا کیا لوگ
گٹھری کال رین کی سونٹی سے لٹکائے
اپنی دھن میں دھیان نگر کو گئے کیا کیا لوگ

گھرے سروں میں عرضِ نوائے حیات کر
سینے پہ ایک درد کی سل رکھ کے بات کر
آ ایک دن مرے دلِ ویراں میں بیٹھ کر
اس دشت کے سکوتِ سخن جُو سے بات کر

اک عمر دل کی گھات سے تجھ پر نگاہ کی
تجھ پر تری نگاہ سے چھپ کر نگاہ کی
روحوں میں جلتی آگ خیالوں میں کھلتے پھول
ساری صداقتیں کسی کافر نگاہ کی
جب بھی غمِ زمانہ سے آنکھیں ہوئیں دوچار
منہ پھیر کر تبسمِ دل پر نگاہ کی
دونوں کا ربط ہے تری موجِ خرام سے
لغزش خیال کی ہو کہ ٹھوکر نگاہ کی

چہرہ اداس اداس تھا میلا لباس تھا
کیا دن تھے جب خیالِ تمنا لباس تھا
عریاں زمانہ گیر شرر گوں جبلتیں
کچھ تھا تو ایک برگِ دل اُن کا لباس تھا
اس موڑ پر ابھی جسے دیکھا ہے کون تھا
سنبھلی ہوئی نگاہ تھی سادہ لباس تھا
ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں پرکھا تو اُن کی روح
بے پیرہن تھی جسم سراپا لباس تھا
صدیوں کے گھاٹ پر بھرے میلوں کی بھیڑ میں
اے دردِ شادماں ترا کیا کیا لباس تھا
دیکھا تو دل کے سامنے سایوں کے جشن میں
ہر عکسِ آرزو کا انوکھا لباس تھا
امجد قبائے شہ تھی کہ چولا فقیر کا
ہر بھیس میں ضمیر کا پردا لباس تھا

تالی بجی تو سامنے ناٹک کی رات تھی
آنکھیں کھلیں تو بجھتے دلوں کا نظارا تھا
دنیا کے اس بھنور سے جب ابھرے دکھوں کے بھید
اک اک اتھاہ بھید خود اپنا کنارا تھا
پھر لوٹ کر نہ آیا زمانے گزر گئے
وہ لمحہ جس میں ایک زمانہ گزارا تھا

برس گیا بہ خرابات آرزو ، ترا غم
قدح قدح تری یادیں سبو سبو، ترا غم
ترے خیال کے پہلو سے اٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں کو بہ کو، ترا غم
غبار رنگ میں رس ڈھونڈتی کرن تری دھن
گرفت سنگ میں بل کھاتی آب جو، ترا غم
ندی پہ چاند کا پرتو ترا نشان قدم
خط سحر پہ اندھیروں کا رقص، تو، ترا غم
ہے جس کی رو میں شگوفے، وہ فصل، تیرا دھیان
ہے جس کے لمس میں ٹھنڈک، وہ گرم لو، ترا غم
نخیل زیست کی چھاوں میں نے بہ لب تری یاد
فصیل دل کے کلس پر ستارہ جو، ترا غم
طلوع مہر ، شگفت سحر ، سیاہیء شب
تری طلب، تجھے پانے کی آرزو، ترا غم
نگہ اٹھی تو زمانے کے سامنے، ترا روپ
پلک جھکی تو مرے دل کے روبہ رو، ترا غم

مجید امجد کی ان غزلوں کی نمایاں بات نئے استعاروں، نہ درتہ علامتوں اور انوکھی تشبیہات کے علاوہ اُن الفاظ کا استعمال ہے جنہیں لوگ تغزل کے نام پر ہاتھ لگانے سے ڈرتے ہیں۔ ایک بڑا شاعر نامانوس اور کھردرے و اکھڑ الفاظ کو اپنے ہنر سے کیسے مانوس صف میں لا کھڑا کرتا اور اپنے قاری کو ان کے استعمال سے لطف کشید کرنے کا موقع دیتا ہے۔ شاید ہماری ادبی تاریخ میں مجید امجد سے پہلے ایسی کوئی مثال موجود نہیں۔ امید ہے کہ یہ انتخاب مجید فہمی کے ضمن میں مزید استمداد فراہم کر سکے گا۔

ناصر جمیل

یادداشت

اس شہر کی تمام گلیاں
مجھے ازبر ہیں
کہاں مُڑنا ہے
کہاں رُکنا ہے
کہاں سے آنکھ بچا کر گزر جانا ہے
ان گلیوں میں ایک مقام ایسا بھی ہے
جہاں خوشبوؤں کا بسیرا تھا
جہاں رات گئے
پورے چاند کی راتوں میں
پریاں اُترا کرتی تھیں
شہر بھی وہی ہے
گلیاں بھی وہی
چاند بھی طلوع ہوتا ہے
مگر
نہ وہ خوشبو ہے
نہ پورے چاند کی راتوں میں
پریوں کا نزول
نہیں معلوم
کہاں مُڑنا ہے
کہاں رُکنا ہے
کہاں سے آنکھ بچا کر گزر جانا ہے
حالانکہ
اس شہر کی تمام گلیاں
مجھے ازبر ہیں!!!!

المنار یو۔ایس۔اے کے لیے
جناب باصِر سلطان کاظمی
کا خصوصی تحفہ

غزل

بادل ہے اور پھول کِھلے ہیں سبھی طرف
کہتا ہے دل کہ آج نکل جا کسی طرف

تیور بہت خراب تھے سنتے ہیں کل ترے
اچھا ہُوا کہ ہم نے نہ دیکھا تری طرف

جب بھی مِلے ہم اُن سے اُنہوں نے یہی کہا
بس آج آنے والے تھے ہم آپ کی طرف

اے دل یہ دھڑکنیں تری معمول کی نہیں
لگتا ہے آ رہا ہے وہ فِتنہ اسی طرف

خوش تھا کہ چار نیکیاں ہیں جمع اس کے پاس
نکلے گناہ بیسیوں اُلٹا مِری طرف

باصرؔ عدو سے ہم تو یونہی بدگماں رہے
تھا اُن کا اِلتفات کسی اور ہی طرف

غزل

ہزار کہتا رہا میں کہ یار ایک منٹ
کیا نہ اس نے مرا انتظار ایک منٹ

میں جانتا ہوں کہ ہے یہ خمار ایک منٹ
اِدھر بھی آئی تھی موجِ بہار ایک منٹ

پتہ چلے کہ ہمیں کون کون چھوڑ گیا
ذرا چھٹے تو یہ گرد و غبار ایک منٹ

ابد تلک ہوئے ہم اس کے وسوسوں کے اسیر
کیا تھا جس پہ کبھی اعتبار ایک منٹ

اگرچہ کچھ نہیں اوقات ایک ہفتے کی
جو سوچیے تو ہیں یہ دس ہزار ایک منٹ

پھر آج کام سے تاخیر ہو گئی باصِرؔ
کسی نے ہم سے کہا بار بار ایک منٹ

Rabwah dreams of the green cap

SABA IMTIAZ | THE CRICKETER | MAY 2016

(Editor's Note: We had published the history of cricket in Rabwah from the beginning to about 1980 in Al Manar USA's Volume 1, issue 1, under the heading "My Reminisces of Cricket in Rabwah", which included the early history of Fazl-e-Umar Cricket Club. Now the premier cricket magazine of Pakistan 'The Cricketer' has carried forward the history of Fazl-e-Umar Cricket Club and the overall history of cricket in Rabwah to the present time, highlighting the discrimination being faced by Ahmadi cricketers in Pakistan. You may read our previous article on cricket in Rabwah at: http://ticalumniusa.org/almanar-usa/almanar-1.pdf).

In a town Pakistan is trying to wipe off its map, a people targeted by the right wing are trying to play cricket

Faisal bin Mubashir thought he could make it. On January 4, 2014, he thought he could pull through to a double-century. "The season was going very well, but I had [been getting out in] the nervous 90s," he recalls as we chat at the ground of the club he used to play for, two years on from that innings. He was playing for Bahawalpur against Quetta in the Quaid-e-Azam Trophy, his 13th first-class match since his debut in October 2011. In the previous four games, he had three times missed out narrowly on a maiden hundred, dismissed for 90, 94 and 81. His memory of the match is fresh. "The first hundred in first-class cricket is a big honour. Sometimes, if you're well connected, you get to play for Pakistan if you score a hundred." Faisal thought he could get to 150, maybe 170 at most. But when he

Abdul Haye (left) and Naveed Ahmad, coach and captain of Fazl-e-Umar, struggle to hold on to talented players, who move to the West in search of better lives and cricketing opportunities © Saba Imtiaz

Zubair Ahmad works in a kitchen-utensils shop in Rabwah and plays for Fazl-e-Umar in his spare time © Saba Imtiaz

crossed 170, he knew a double was on, even though there was pressure from the coach to declare. On 197, he waited out a couple of overs, until he finally sneaked a boundary. He would go on to make 216.

Faisal is 29 years old and now lives in Bahawalpur, in the south of Punjab. Last September, in Pakistan's T20 Cup - which used to be the premier domestic T20 tournament before the Pakistan Super League (PSL) was created - Faisal played for Bahawalpur Stags and was the tournament's leading scorer, with five match awards in nine matches. The performances did not attract much attention. Faisal can only guess why - perhaps, he says, it is because he comes from a small, much overlooked cricket district. Playing for Pakistan, he feels, is a long shot. "If a hundred people are practising, then only one will

come out of it playing for Pakistan… people dream of this."

Three of his fifties came in the first stage of the tournament, a qualifying round for weaker sides. He flagged a little on the bigger stage, though not dramatically. But it was this that Haroon Rasheed, Pakistan's chief selector, alluded to when I spoke to him about whether Faisal was on their radar: "He played well in the early qualifying rounds, but as he progressed he wasn't consistent enough."

Faisal is not a big name and doesn't often make headlines. He isn't the subject of feverish online debate, but there is a town where Faisal's story is repeatedly told, the town we are in now, where almost every cricketer knows his name and statistics. This is Rabwah, home to Faisal's former club, Fazl-e-Umar CC, a town where stories of broken dreams abound.

****

It has been brought to our attention that the Anjuman Ahmadiyya is holding a sports tournament within Rabwah, which has antagonised people. There is a great danger to peace. In view of this great danger, the sports tournament should be closed.

A local magistrate's letter to Hakim Khurshid Ahmad, the head of affairs for the Ahmadiyya community in Rabwah, dated February 10, 1994

****

It is past 10am on a Sunday in January, but the host team - Fazl-e-Umar - is owhere to be seen at Rabwah's cricket ground. A teenager arrives, looks around, and starts doing push-ups. Naveed Ahmad, the 36-year-old club captain, arrives soon after. He makes a series of brusque phone calls telling his team-mates to hurry to the ground. Eventually the team straggles in, in ones and twos, and in uniforms that are several shades of white and off-white. One player has a cap in the colours of the German flag; others

The Ahmadis don't practise their faith openly, and refuse to contest elections or vote, and are legally barred from practising Islam or calling themselves Muslims © Getty Images

wear blinding white sneakers. The T-shirts hang off the younger players' lanky frames, their bodies unsullied by the sedentary lifestyles so common in Punjab.

Many of these players grew up in Rabwah. Some moved here from other cities. Abdul Hai, a 31-year-old real-estate dealer from Lahore, comes down to Rabwah for the cricket season. Faisal and his younger brother, Rafay Ahmed, are expected to arrive soon; they are playing for Fazl-e-Umar today.

The graves in Rabwah of victims killed in the attack on Ahmadiyya mosques in Lahore in May 2010 © Getty Images

Rabwah is home to Pakistan's Ahmadiyya Muslim community. It lies just past the city of Chiniot, the languid Chenab River, and a series of oddly shaped, craggy red rock hills - a town that has literally fallen off the map. It was renamed Chenab Nagar in 1998, but the name hasn't stuck. Rabwah has all the signs of the newfound urbanisation sweeping Punjab; ads for Schengen visas and magical cures to increase one's height abound. It also bears signs of the changes wrought by years of attacks on the Ahmadiyya sect: buildings with high walls - it is markedly visible where the new bricks were added - and barbed wire, armed patrols and security cameras. Dozens of Ahmadis have made Rabwah their home in recent years. Some arrived in coffins. Others were fleeing mobs and militants.

For over 40 years, the sect has been the target of a wide-ranging campaign of systematic abuse and discrimination, fuelled by the state's 1974 decree that, at a stroke, made Ahmadis non-Muslims. The Pakistani clergy and right wing believe Ahmadis dispute a key tenet of Islam - that Muhammad was the last Prophet - while Ahmadis believe that the founder of their movement, Mirza Ghulam Ahmad, is the second coming of a promised messiah, and not a new prophet. In 1984, Pakistan effectively made it illegal for Ahmadis to practise Islam, equating their doing so to an act of blasphemy. Blaspheming

against Prophet Muhammad is punishable by death in Pakistan, and the blasphemy law is often used to target Ahmadis.

With all but state-sanctioned approval, militants have attacked Ahmadi mosques (in 2010 one attack in Lahore killed 94) and the right-wing clergy and hard-line religious groups have embarked on a campaign of assassinations, blasphemy cases, a social and economic boycott, and general widespread discrimination. If the dream of playing cricket in Pakistan is passed down from one generation to the next, so are the reins of the anti-Ahmadi movement. Pakistani children are told at school that Ahmadis are non-believers and blasphemers. Every key government form - from a passport application to voter registration - requires Pakistani Muslims to sign a declaration rejecting the Ahmadiyya faith. The community is largely absent from public life: they do not practise their faith openly, refuse to contest elections or vote because they object to the separate electorate for Ah-

Faisal bin Mubashir (left) and his brother Rafay Ahmed have come disappointingly close to being selected for top-level teams in Pakistan © Saba Imtiaz

madis, and are legally barred from practising Islam or calling themselves Muslims. Countless Ahmadis have left Pakistan after the sect was excommunicated, finding new homes in Europe, the US and Canada.

Even though over 60,000 Ahmadis live in Rabwah, there is no safety in numbers. The misery of being constantly hounded never fades. In Rabwah's main library, a case that used to hold translations of the Quran has been emptied for fear of the potential repercussions. Ahmadis can't be seen to be keeping copies of the Quran, and Ahmadi translations or interpretations of the text can also be problematic. Just months earlier an Ahmadi man was sentenced to prison for eight years for allegedly selling religious texts in his shop. The library entrance now bears a sign saying that the facility is only for Ahmadis.

Over the last six years Naveed has felt the mood in the cricketing milieu shift to outright hostility against Ahmadis. These long-held prejudices - cemented in schools, in the law, and in daily life - play out across Pakistan, and have managed to creep into the Ahmadis' home ground in Rabwah.

"There are many teams that come from Faisalabad and they'll play the match but won't eat," Naveed tells me, switching between dense Punjabi and Urdu. "They'll play the match. Won't eat," he repeats, as if still incredulous that people can go without food to maintain their prejudices. "I think we once had chicken [for the teams' lunch], and this kid from Saeed Ajmal's academy came to me and said: 'Naveed bhai, aap murghi halal karte ho?' (Do you slaughter the chicken according to Islamic dictates?) I said, thank God, I'm a better Muslim than you."

A policeman guards Garhi Shahu mosque, an Ahmadi place of worship in Lahore, which was attacked in May 2010 © Getty Images

Another visiting cricketer insisted his team had to go for Friday prayers to a mosque, but then refused to pray with the Ahmadis at the time they were going to pray, or to pray at the ground, because the cricketer said they would have to listen to the Ahmadi prayer leader's sermon.

Because the prayer times were different, the match was in danger of being called off. They eventually packed off the visiting team to a nearby non-Ahmadi mosque, and the ensuing match was tinged with bitterness. This has happened more often in recent years, Naveed says, as the influence of religion in cricket has crept into the lowest levels of the game. Some teams don't care about the faith of Rabwah's cricketers. Others can't afford to care, because they want to curry favour with the club's coach or play at their ground.

On this Sunday morning, the players of the Zain Cricket Club have driven all the way from Faisalabad in a van, and don't know why their hosts are so late. When Abdul Haye, Fazl-e-Umar's coach, finally emerges, he has a good reason for not being there: he had delayed the match because of dew on the ground.

The reason why cricket thrives in this blighted town is this ground, a thing of beauty: an expanse of curated grass, a practice area, a smooth pitch and an 80-metre boundary. Trees frame the property and the red rock hills loom in the background.

The ground only exists because of Pakistan's anti-Ahmadi tenets. The land was originally earmarked for the annual Ahmadi jalsa, a large, multiple-day religious event. But the Pakistani government refuses to grant permission to hold the event, which is now organised in other countries with sizeable Ahmadi populations. Rabwah has also repeatedly been refused permission to host sports events, including inter-community tournaments. So the community decided to develop the property as a cricket ground instead. This explains why it doesn't have an official name.

Fazl-e-Umar CC's players at their ground in Rabwah

Until about 12 years ago, there were rumours that the property was ridden with snakes. It was a rock-strewn, disused piece of land. It took months to clear, and a PCB advisor was asked for help with plotting out the pitch. Cricket is now played in Rab-

wah through the year, except for a couple of months in the summer when the punishing heat and the humidity from nearby paddy fields make it difficult to do so. Rabwah's cricketers repeatedly describe the ground as a blessing. They brag that there isn't another ground like this in the entire district.

Fazl-e-Umar's players find themselves at the ground every day. Work hours at the Ahmadiyya community's offices end at 2pm and there is little else to do other than amass at the ground. "Awaragirdi karni hai na?" [We have to loaf around passing time right?] Naveed says. "I start playing instead."

Like many of Rabwah's cricketers, Naveed has had a shot or two at aspiring to the major leagues: playing for the district, a trial for a first-class team. When he played in other cities, he says his teammates, including Misbah-ul-Haq, were often surprised he had never been called up for bigger sides. He doesn't have an answer for them, because, he says, he has never been told the reason outright. But he believes that his faith "is the biggest reason".

For now, he has to lead his team to victory.

Folding chairs are quickly set up, a thermos of tea and a couple of cups circulate among the players, and the toss takes place. The hosts lose and are asked to bat first. Coach Haye settles into his chair. He has already run a few miles this morning, he says, rebuking the player sitting next to him, whose belly is straining against his shirt. "He's eaten gobiparathas today," the coach says, in mock exasperation.

"I'd planned to eat these parathas today," the player responds.

"Planned!" Haye snorts, setting off a round of teasing and admonitions.

Earlier that weekend Haye was watching a match at the ground, sitting in a folding chair that creaked under his sizeable frame. Rabwah Cricket Club, the other prominent club in town, was hosting a team from Faisalabad. The clubs split use of the ground, taking turns on alternate Fridays, Sundays and Wednesdays.

When Haye was growing up, he played cricket on a ground near Rabwah's main mosque. His parents couldn't afford to send him to study in Lahore, so he went to the local Taleem-ul-Islam College.

Rabwah's cricket ground was originally meant to be used for an annual Ahmadi religious event © Saba Imtiaz

During his secondary education, he moulded himself into a fast bowler. Cricket wasn't the town's dominant sport in the '60s and '70s - Rabwah's boys were big on rowing and basketball. Haye joined Fazl-e-Umar, which he recalls was formed in either 1969 or 1970 and was then registered under the Faisalabad division.

"There were about 20 to 30 of us," Haye remembered. He still has a pile of clippings about his short-lived career, culled from newspapers of the day - the Muslim and the Pakistan Times. In 1972, Haye was the only boy selected from Rabwah for Sargodha division's Under-19 team. He was recruited by the Pakistan Army to play for its myriad department teams. "During my time, the 501 Workshop [part of the army's engineering branch] won the inter-army championship for the first time in its history," Haye said. It was a feat he helped pull off by convincing the team management to let him bring in a couple of players from Rabwah - his brother and brother-in-law - and another from Islamabad. "I can't win with the players you've got," he told them.

Then Haye heard from Pakistan Television, who were not a first-class side at the time but in the grade below. They wanted to sign him up. Haye had a club match that day but he was in a car accident on the way to the game. That put him out of commission for a couple of months, effectively signalling the beginning of the end of his cricketing career. Meanwhile, jobs for Ahmadis were drying up. Haye's brother, his former coach and team-mates had already left for the West. He stayed back in Rabwah to take care of his parents, particularly his mother, who was bedridden. He opened a couple of businesses, including "Cassette House" - which now sells CDs but hasn't changed its signage - and a sporting goods shop.

By the early 2000s Fazl-e-Umar was floundering. Its star players were long gone, and there was no place to practise. Haye stepped in, registered the club with the PCB, and tried to whip the team into shape. Instead of finding conventional financial supporters, he roped in former team-mates, now comfortably ensconced in places like Germany. "I've made them into sponsors," he explained. "I said, 'Look, if you send €100 [approximately U$114], then we can do net practice for a month.' If I need to do nets, I need 14 bowlers, and 14 balls cost Rs 4000 [$38]. And if you don't change the ball after

four or five days, the boys don't play." Despite issues with his back, Haye still bowls 40 to 50 balls a day in the nets.

Fazl-e-Umar routinely play against visiting clubs and tour other cities, though Haye notes that nowhere else are the facilities as good. Occasionally a star cricketer or two has shown up in Rabwah, including Rana Naved-ul-Hasan, Saeed Ajmal and Mohammad Hafeez. Ajmal, the legend goes, was hit for seven sixes in six overs, and the umpire wanted to report his action. Haye stopped him from doing so, not wanting to offend their guests.

Rabwah has no star cricketers of its own. Faisal bin Mubashir may be the best-known Ahmadi cricketer in recent years, and while his team-mates know of his faith, it isn't a fact he pushes in anyone's face. When he visits Rabwah he tries to pass on to the club's players what he has gleaned over the years.

There is an Urdu phrase that you will hear often in Rabwah: rang lagna. Literally, it means to be coloured, but in this case it is taken to mean getting the green cap of Pakistan. This national recognition remains out of reach in Rabwah, where the belief that societal discrimination against Ahmadis must naturally extend to cricket is embedded. None of the boys believe they will ever have a shot at representing Pakistan, even if only a few have gone further than club cricket.

On the surface their stories are not different to those of so many aspiring cricketers who feel they have not got their due because they didn't have the right connections or didn't come from the right part of the country. But unlike the majority, underpinning the disgruntlement of these stories is their faith.

"It's one thing if there is a future," Anas Amin, a 22-year-old bowler, tells me, his head bowed as he tries to keep score at the Sunday match. "The religious issue comes in between."

"You need a lot of hard work to play first-class," says Zubair Ahmad. "And our class will be an issue. We can't even greet anyone with salaam." (Ahmadis are not allowed to use Islamic words.)

The club has produced an array of cricketers they feel were above ordinary - several star batsmen, a fast bowler they felt was better than some who had represented Pakistan. But no one sticks around long enough. "They're all looking for an agent who can take them to Germany," Haye says and laughs. Eight of the club's best players recently moved to Germany, leaving Haye in the lurch, scrambling to recruit and train more players. The legend of the men who left overshadows almost every conversation. Everyone has a brother, a cousin or an uncle who made it out, and who managed to keep playing cricket in a league in England or Holland or Germany.

Leaving isn't easy. It can cost up to $15,000 to get out of Pakistan. "Anyone who has that much money can go to Germany or England, where their life will be much better," Zubair says. "They can play cricket in England. And earning a thousand [euros] there means Rs 100,000 in Pakistan." Many Ahmadis travel to Thailand or Sri Lanka, where they try and claim asylum, or use it as a base to strike out to Europe.

Zubair wants to leave too, but his family doesn't have the money. He's hoping to convince his father to at least send his brother away. Zubair started playing cricket the year Mohammad Amir got banned. Amir is set to return to the Pakistan side a few days after this match and Zubair plans to watch. "Once he comes and plays, everyone will realise that he is a good bowler. There is no other bowler like him. He is a child who made a mistake."

Zubair stopped studying after second grade. He says he was far more interested in cricket. He only speaks in Punjabi, though a word or two of Urdu occasionally squeezes itself into conversation. He seems far too young to be burdened with the life he leads. "My brother works in the graveyard and I work at a kitchen-utensils shop in the market. I earn Rs 3000 [about $29] a month. I work two and a half hours in the morning, and another two hours in the evening."

It is a bright, clear day and it feels like June as the sun beats down on the ground; remarkable for early January in Punjab. Layers are being peeled off, and the match continues.

Every so often, someone yells out for the score. Both teams have their own scorers, and after every four overs, someone runs to the magnetic scoreboard to change the tiles. The teams tally their scores; if there is only a few runs' difference, the visiting team's score comes up trumps. Matches are usually of 30 to 35 overs an innings; on Fridays the Rabwah team needs to wrap up matches before the telecast of the weekly sermon from London by the head of the community.

When the home team bats, the rest of the players break off into little circles for practice. There's a slightly disconnected sense to the proceedings - or perhaps a paratha-induced stupor - but the runs keep racking up effortlessly. Batting first, Fazl-e-Umar end with over 250 and go on to win the match. But Haye's training, the ground's upkeep, and the discussions over technique all seem ultimately futile. The club's future seems limited.

Fazl-e-Umar comes under the administrative purview of the Jhang District (which is part of the Faisalabad Region). Haye describes Jhang's cricket officials as helpful, though Jhang is the home of the sectarian and militant Ahle Sunnat Wal Jamaat.

Not everyone is helpful. The city of Chiniot has long been a hub of anti-Ahmadi sentiment and organises an annual anti-Ahmadi conference each year to mark the legal excommunication of Ahmadis from Islam.

Haye alleges that Chiniot's sports officials exclude Rabwah's teams or cricketers from tournaments they host. "This is cemented in their heads," he says. "They're sitting there with these long beards, and they've just decided that they're not going to have us play."

Sohaib Ali, secretary of Jhang's cricket association, told me that they have picked players from Fazl-e-Umar in the past, for U-19 tournaments and senior ones. "When boys are playing, they don't care who is from what religion," he said. "There has never been an incident where this has come up." He also corrected me and said the town's name was Chenab Nagar.

There is indeed little proof on paper that an anti-Ahmadi policy exists to disenfranchise cricketers, from the PCB down to local tiers, but religious bias is rarely articulated as public policy. The possibility that other factors play a role in Rabwah's players not being selected cannot be discounted. As Haye acknowledges, there is a culture of politicking and favouritism and lobbying at every level of Pakistani cricket, which mistakenly denies and rewards players all the time. But with Ahmadis, the "religious label", as Haye sees it, cannot help but add another layer.

Given that cricket is synonymous with a conflated sense of nationalism as well as Islamic identity, it doesn't seem possible in the current climate that an Ahmadi would be selected for the Pakistan side without causing some kind of furor. (By contrast, hockey is so ignored now that it seems to have largely escaped attention that an Ahmadi has captained the national side in the modern age.)

In Pakistan, the idea of selecting an Ahmadi for a job can become an issue of national concern; a key demand of the anti-Ahmadi movement was to fire Ahmadis from government jobs. As the noted physicist and writer Dr Pervez Hoodbhoy once recalled, Benazir Bhutto refused to meet Dr Abdus Salam after he won the Nobel Prize in 1979. Salam, who was Ahmadi, had helped advise Pakistan's nuclear programme during the government of Benazir's father, Zulfiqar Ali Bhutto. In 2014, Imran Khan said he wanted the prominent economist and Princeton professor Dr Atif R Mian in his cabinet. Imran, apparently, had no idea that Mian was an Ahmadi; after a backlash from the right wing, Imran appeared in a video contritely professing that he had only read about Mian in a magazine, and that he did not believe that anyone who followed Mian's faith was a Muslim.

Mian pithily responded on Twitter: "Stop trying to play God."

June 7, 1975 was no ordinary day. This was no ordinary match. It was Pakistan's firstgame in the inaugural World Cup, against Australia at Headingley. A 25-year-old debutant right-arm fast bowler would bowl the first ball of the match for a side that included the core of Pakistan's great mid-'70s team. He was, by common consent, a promising prospect, especially suited to conditions in England.

He had actually begun life as a batsman, until, at a training camp, the great Fazal Mahmood told him he should become a fast bowler. He debuted for lowly Khairpur but soon moved to Karachi and found employment and a cricket career with the National Bank of Pakistan (NBP). Across two domestic seasons - 1973-74 and 1974-75 - he took 90 wickets; in between this spell he won selection on the tour of England in 1974, ahead of the veteran Saleem Altaf, and took 20 wickets there, though he did not play a Test.

This man was Naseer Malik, and as Haye reveals, he was an Ahmadi. Haye says this almost as a casual fact, as if it is normal, as if it isn't a big deal.

The revelation hangs in the air. It is difficult to comprehend. Pakistan's first ball in a World Cup was bowled by an Ahmadi. Pakistan's first ball in a World Cup was bowled by an Ahmadi.

Malik bowled that ball nine months to the day after his country's parliament had passed a law constitutionally excommunicating him and his community. In the months that preceded that day and the ones that followed it, Ahmadis were dubbed traitors and heretics. alik did well, taking 2 for 37 and ending the World Cup with five wickets. He was, in fact, Pakistan's joint-leading wicket-taker for the tournament, alongside Imran Khan and Sarfraz Nawaz. He never played for Pakistan again. Haye believes Malik was selected for the World Cup because the impact of the 1974 decision was yet to set in, and because the team needed him.

According to Khadim Baloch's Encyclopaedia of Pakistan Cricket, Malik suffered an ankle injury that kept him out of cricket for much of the following season. When he returned he did well, and as part of ZA Bhutto XI against New Zealand, in October 1976, he was on the fringes of national selection again. He did not make it, though perhaps a lack of motivation had something to do with it. In an interview with the Cricketer (Pakistan) in December 1975, Malik said he did not consider himself "a professional cricketer". Cricket was a hobby, he said, and he was proud he had got a job at NBP on his educational merit (as an engineer) and not through a sporting quota. Eventually he retired from first-class cricket in 1982, returning in the mid-'90s as a match referee. He supervised a fast bowling camp organised by Sarfraz in 1999. On August 1 that same year, he died of a heart attack. He was buried in Rabwah.

What was he thinking that day in June when he made his Pakistan debut? Would he have thought about his journey, from his birth in Lyallpur (now Faisalabad) to captaining his college team, to this moment at Headingley? Did he know he was making history in more ways than one? Did he know that Ahmadi boys would never dream of what he had achieved? Did he imagine a world where his team-mate that day, Imran Khan, would shun the idea of even hiring an Ahmadi or asking Ahmadis for their votes? Did he know that 41 years after he made history, Ahmadi boys would be told to "join the circle of Islam", and that their team-mates would refuse water if they drank it first?

In 2013, Faisal bin Mubashir's brother Rafay was waiting for his turn to play in a practice match in Lahore. He had been selected for the Pakistan U-19 side for a tri-series to be played in England that August. Rafay was excited about the future, about the possibility of playing in a game that would be broadcast and watched back in Pakistan by his parents and family. As Rafay waited - the burden of expectations, his own, his family's, weighing on his shoulders - the team physician turned to him. "Become a Muslim," he said.

Rafay had a ready retort, honed from years of being teased and mocked about his faith in school: "I'm going to play now. I'll become a Muslim after that."

Before this "invitation", Rafay had gone to apply for a visa for the tournament in England. The physician had spotted Rafay's religion on his passport. "So he started asking around [the others], 'Are you Ahl al -Hadith?' [people of the traditions of the Prophet]," Rafay recalls. "When he asked me, I said, 'Thank God, I am a Muslim.' He said, 'What kind of Muslim?' I said 'I'm an Ahmadi Muslim.'"

He still can't describe the feeling of representing Pakistan. He sat out the first four games before playing two and missing the final, which Pakistan won. He scored 35 and 1. He then played another couple

of games against England U-19 in December that year, in the UAE, but made only 1 and 1. It's easy to see why he wasn't selected later, especially as there were others in those sides who impressed and progressed (Sami Aslam and Zafar Gohar, to name just two). Rafay admits to a lack of performances. Now he hasn't played professional cricket in a while. He missed a season because of a badly twisted foot, and now can't find a place in either a local or first-class team.

In Rabwah, one name is now the living epitome of the town's disappointment, the crystallisation of its disillusionment: Faisalbhai. "No one is as unlucky as Faisal," Haye says. "If you can't make it to the Pakistani side after performing this well, then what is the criteria??"

After each match in that domestic T20 Cup, Faisal's old coach Khalid Farooq convinced him that the PCB was watching, that they just wanted to see how he would do in the next one, or the one after that, or the high-stakes match against Lahore. "We were staying at the Hill View Hotel [in Islamabad]. All the players [of all teams] were there, except for [Shahid] Afridi. Everyone was saying that Faisal is going to be named in the national squad, that it had to happen now. I told the coach that I have to put my name forward, and he kept saying, 'When you get the good news, call me.'" Faisal kept hearing that his name was all but final for one squad or another, in Pakistan's A side, if nothing else.

But after the tournament, there was silence. Faisal is reluctant to go into further detail or assign blame for his not being picked. Perhaps, he says, it is because he is from Bahawalpur and not a major city like Karachi or Lahore. Haye and the others insist it is because Faisal is Ahmadi. He has not hidden his faith. His family are prominent members of the community in Bahawalpur, and many of his teammates over the years have found out because he has had to bow out of praying with them.

"Some people do discriminate, but I don't feel it," Faisal says, demonstrating a sense of patience far beyond his years. "When there's a water break, if I drink water first, then I can tell that some people won't drink it then. So there are these small differences that keep cropping up. Anyway, you can guess what's going on. I try to drink water right at the end."

He is not sure whether anyone in the PCB is aware of his faith. When I asked Rasheed whether or not Faisal's faith had played a role in his non-selection, he said: "I can say for myself and for the selectors that we do not think of this. As national selectors we are not representing a particular place. Our thought process has to be 'national' for us to pick a national team."

One problem, as another selector, the former fast bowler Saleem Jaffar, pointed out is that Faisal is not yet part of a big-name department side. He signed on with State Bank of Pakistan (where his father works) just before the T20 Cup, but they are a Grade II side and not yet playing first-class cricket. "The quality is better than that of regional cricket, and the boys play with Test cricketers," Jaffar explained. "If a boy plays well in a region, a department will pick him right away, and that's where he's made."

Cricket is very much part of Faisal's family. As well as Rafay, his oldest brother, Muneeb, played and looked destined to do so professionally. "Our father had given him permission," Faisal says, pausing to sip his tea. But Muneeb's career was cut short, Faisal says, because it was difficult at the time for boys from small-town Bahawalpur to make it into a regional team. Muneeb now lives in Germany. Aqeel Anjum, an older cousin, has also forged an accomplished first-class career as a batsman.

Mubashir Ahmad, the father of the boys, is to be credited for encouraging the three to play cricket. "There are very few parents like ours, who give the kind of support our father has given us," Faisal says. "Parents tell their children to become doctors and engineers. But our father said, 'Fine, study, but if you want to play cricket, do it properly. Make a name for yourself.' People would ask him what his children did, and he'd say, 'They play cricket.'"

Initially, studies did get in the way. Though Faisal's first breakthrough came in 2004, when he played for Bahawalpur's U-19 team in an inter-district tournament, he soon went back to studying

for a master's degree at Rabwah's School of Theology. It was there that Haye spotted him playing in a tournament. When Faisal returned to cricket again, in 2011, he played for Jhang in an inter-district tournament and propelled them to victory in the final against Faisalabad.

"That final [for Jhang]... I had confidence and talent, but I didn't have the practice, because I'd been out of cricket for five years." He made 113 in the first innings, and 67 in the chase in the second. A few months later he was making his first-class debut for Faisalabad, scoring 72 in his first innings against PIA in the Quaid-e-Azam trophy. Four years later came the performances in the T20 Cup that did not bring him much attention.

"It's the kind of performance you only have in your dreams," he says. "God was so kind." He prefaces almost every other sentence with an earnestAlhamdulillah and mash'Allah.

Pakistan did not come calling and neither did any side in the PSL. A franchise official responsible for player picks said Faisal's performances in the T20 Cup had been monitored but gave the impression that he was not an especially fashionable choice: a one-down anchor for a weak regional side, nearly 30. Five, six years ago, maybe, not now. On the day that Faisal realised he wasn't being drafted, Rafay declared he wouldn't let anyone watch a single match of the league in his room, where usually every match is watched on a flat screen TV, in fullmahol (atmosphere).

Rafay is Faisal's biggest champion. He helps him train and stick to a low-carb, protein-heavy diet, and once challenged him to race until one of them dropped (it took over two hours for Faisal to beat Rafay). The brothers encourage each other, even as they face the unending spate of disappointing news. "He became emotional when I wasn't named for a [PSL] team," Faisal says. "Our father said that we shouldn't worry. Whatever God has done is for the best.

"I was ready with my bag and was supposed to go the ground when the live announcement [for the PSL] was airing on ARY. I was sitting there thinking, 'My name will appear just now… when I leave, I'll go to the dessert shop, buy boxes of sweets and distribute it to everyone in the ground.'"

When his name wasn't announced, Faisal was disappointed. "I felt like putting my bag down and not going. But that would be giving up, and this is a sin. Whatever it is, I have to go. I didn't practice the way I should have. I was trying to get rid of my frustration; I hit every ball in the nets. There was a frustration that anyone would have. But it's not that I've lost the will and become disenchanted. I think that God will do what's best for me.

"And if it isn't meant to be, it won't happen."

Meanwhile, a community waits for someone to break the glass ceiling. Faisal's uncle, Kashif Imran, lives in Rabwah and occasionally plays for Fazl-e-Umar. He wants to see any Ahmadi cricketer break through, not just Faisal. "It'll be a break. It'll erase this indelible stamp that's there right now - that they won't get an Ahmadi to play. If that kind of thinking exists, it'll change that. If just one guy represents, the path can open up."

Saba Imtiaz is a freelance journalist and the author of Karachi, You're Killing Me!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظارت تعلیم

صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ

نمبر:
تاریخ:

مکرم و محترم ڈاکٹر صفی الدین چوہدری صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ آپ بخیریت ہونگے۔

آنمکرم کی طرف تعلیم الاسلام اولڈ سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن سکالرشپ کے حوالہ سے ای میل موصول ہوئی جس میں جن طلباء کو اس سکالرشپ سے نوازا گیا آنمکرم ان کے نام بھجوائے جانے کی گزارش کی ہے۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء

اس سلسلہ میں تحریر خدمت ہے کہ تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن۔ یو ایس اے چیپٹر کی جانب سے ذہین اور ضرورت مند طلباء وطالبات کیلئے سکالرشپس اور فنڈز جاری ہیں۔ جس کیلئے TICA-USA کی جانب سے سالانہ USD 15,000/- کی رقم موصول ہوتی ہے۔

تعلیم الاسلام اولڈ سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن سکالرشپ کو درج ذیل دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

1. **تعلیم الاسلام اولڈ سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن قرض فنڈ**

- اس فنڈ سے ذہین اور ضرورت مند طلباء وطالبات کی مدد کی جاتی ہے۔ جس کیلئے سالانہ مبلغ USD 7,500/- کی رقم مختص ہے۔
- **اس طرح کے فنڈز سے استفادہ کرنے والے طلباء وطالبات کے نام نظارت تعلیم کی طرف سے کسی کو نہیں بتائے جاتے۔**

2. **تعلیم الاسلام اولڈ سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن میرٹ بیس (Merit Base) سکالرشپ**

- اس سکالرشپ کو چھ مختلف categories میں تقسیم کیا گیا ہے جس کیلئے سالانہ مبلغ USD 7,500/- کی رقم مختص ہے۔
- کسی بھی category میں درخواست موصول نہ ہونے کی صورت میں اس category کی رقم اگلے سال کے سکالرشپ میں جمع کر دی جاتی ہے جس سے اگلے سال میں ایک سے زائد احباب استفادہ کر سکتے ہیں۔
- **گذشتہ سال جن طلباء وطالبات کو یہ سکالرشپس دیئے گئے انکی تفصیل لف ھذا ہے۔**

Phone: 047-6215448 Fax: 047-6212398 E-mail: info@nazarattaleem.org
www.nazarattaleem.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظارت تعلیم

صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ

نمبر:

تاریخ:

NAZARAT TALEEM

تعلیم الاسلام اولڈ سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن سکالرشپ اور فنڈ کیلئے امسال بھی بہت سے طلباء وطالبات کی درخواستیں موصول ہو رہی ہیں۔اس سلسلہ میں آپ سے درخواست ہے کہ اس سال کیلئے مقرر کردہ رقم مبلغ -/USD 15,000 بھجوا کر ممنون فرمائیں۔تا کہ طلباء وطالبات کی بروقت مدد اور انعامات کی تیاری کی جاسکے۔

اللہ تعالیٰ آپ کے اموال ونفوس میں بے انتہا برکت پیدا کرے اور آپ کو اخلاص ووفا میں بڑھاتا چلا جائے۔

جزاکم اللہ احسن الجزاء

والسلام

خاکسار

ناظر تعلیم

Phone: 047-6215448 Fax: 047-6212398 E-mail: info@nazarattaleem.org
www.nazarattaleem.org

TICA-USA Scholarship I

یہ سکالرشپ نظارت تعلیم کے تحت کالجز میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں پہلی تین پوزیشن حاصل کرنے والے طالب علم یا طالبہ کو دیا جاتا ہے۔

پوزیشن	نام طالب علم	ولدیت	حاصل کردہ نمبر	انعام
اول	سدرہ قریشی	قیصر محمود قریشی صاحب	91.00%	25ہزار روپے
دوم	فریال چیمہ	عبدالحئی چیمہ صاحب	88.82%	7ہزار500روپے
دوم	سید دانیال احمد	سید غلام احمد فرخ صاحب	88.82%	7ہزار500روپے
سوم	سید تحمید احمد	سید جلید احمد صاحب	87.73%	10ہزار روپے

TICA-USA Scholarship II

یہ سکالرشپ نظارت تعلیم کے ادارہ جات کے ان اساتذہ کو دیا جاتا ہے جو اپنی ملازمت کے دوران کسی بھی منظور شدہ ادارہ سے ایم فل/ایم ایس کی تعلیم مکمل کریں گے۔

ادارہ	اسماء اساتذہ	یونیورسٹی	انعام
نصرت جہاں بوائز کالج	حافظ طارق شہزاد صاحب	Chulalongkorn University, Bangkok, Thailand	50ہزار روپے
نصرت جہاں کالج	نورالصباح صاحبہ	سرگودھا یونیورسٹی	50ہزار روپے
نصرت جہاں بوائز کالج	وقار ناصر صاحب	ایگریکلچر یونیورسٹی فیصل آباد	50ہزار روپے
نصرت جہاں کالج	لبنیٰ سوسن باجوہ صاحبہ	بحریہ یونیورسٹی اسلام آباد	50ہزار روپے

TICA-USA Scholarship IV

یہ سکالرشپ پاکستان کے کسی بھی منظور شدہ یونیورسٹی سے بی ایس (آنرز) کسی بھی مضمون میں مکمل کرنے پر موصولہ درخواستوں میں اول، دوم اور سوم پوزیشن حاصل کرنے پر دیا جاتا ہے۔

پوزیشن	نام طلباء	ولدیت	مضمون	حاصل کردہ نمبر	یونیورسٹی	انعام
اول	سائرہ سمیع خان	عبدالسمیع خان صاحب	فارمیسی	CGPA 3.95	ہجویری	60ہزار روپے
دوم	نعمانہ عائشہ مجید	میاں مجیدالرحمان صاحب	Statistics	CGPA 3.93	پنجاب	50ہزار روپے
سوم	ضوفشاں سنبل	ادریس احمد صاحب	فارمیسی	CGPA 3.92	ہجویری	40ہزار روپے

TICA-USA Scholarship V

یہ سکالرشپ پاکستان کے کسی بھی منظور شدہ یونیورسٹی سے کسی بھی مضمون میں ایم فل/ایم ایس کی تعلیم مکمل کرنے پر موصولہ درخواستوں میں اول اور دوم پوزیشن حاصل کرنے پر دیا جاتا ہے۔

اول	عالیہ نسیم	محمود علی صاحب	Mathematics	CGPA 3.82	UMT Lahore	80ہزار روپے
دوم	شکیل احمد بابر	بشیر احمد صاحب	لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس	CGPA 3.79	منہاج لاہور	70ہزار روپے

TICA-USA Scholarship VI

یہ سکالرشپ پاکستان کی کسی بھی منظور شدہ یونیورسٹی سے MBBS اور بیچلرز آف انجینئرنگ تعلیم مکمل کرنے پر دیا جاتا ہے۔ایک انعام ایم بی بی ایس اور ایک انعام انجینئرنگ کے لئے ہے۔

MBBS	انعم صدیق	محمد صدیق ضیاء صاحب	MBBS	72.78%	پنجاب	75ہزار روپے
انجینئرنگ	فیصل محمود	فضل محمود صاحب	سول انجینئرنگ	94.75%	UET ٹیکسلا	75ہزار روپے

Rabwah dreams of the green cap
Article by Saba Imtiaz ... Page 60
Vol 2, No 3—July 2016
AL MANAR
A scholarly and literary magazine of Talimul Islam College Alumni Association, USA